ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

اِس شمارے کے ساتھ

پاکٹ کلینڈر

کا تحفہ حاصل کرنا نہ بھولیئے

جنوری ۱۹۹۵ء

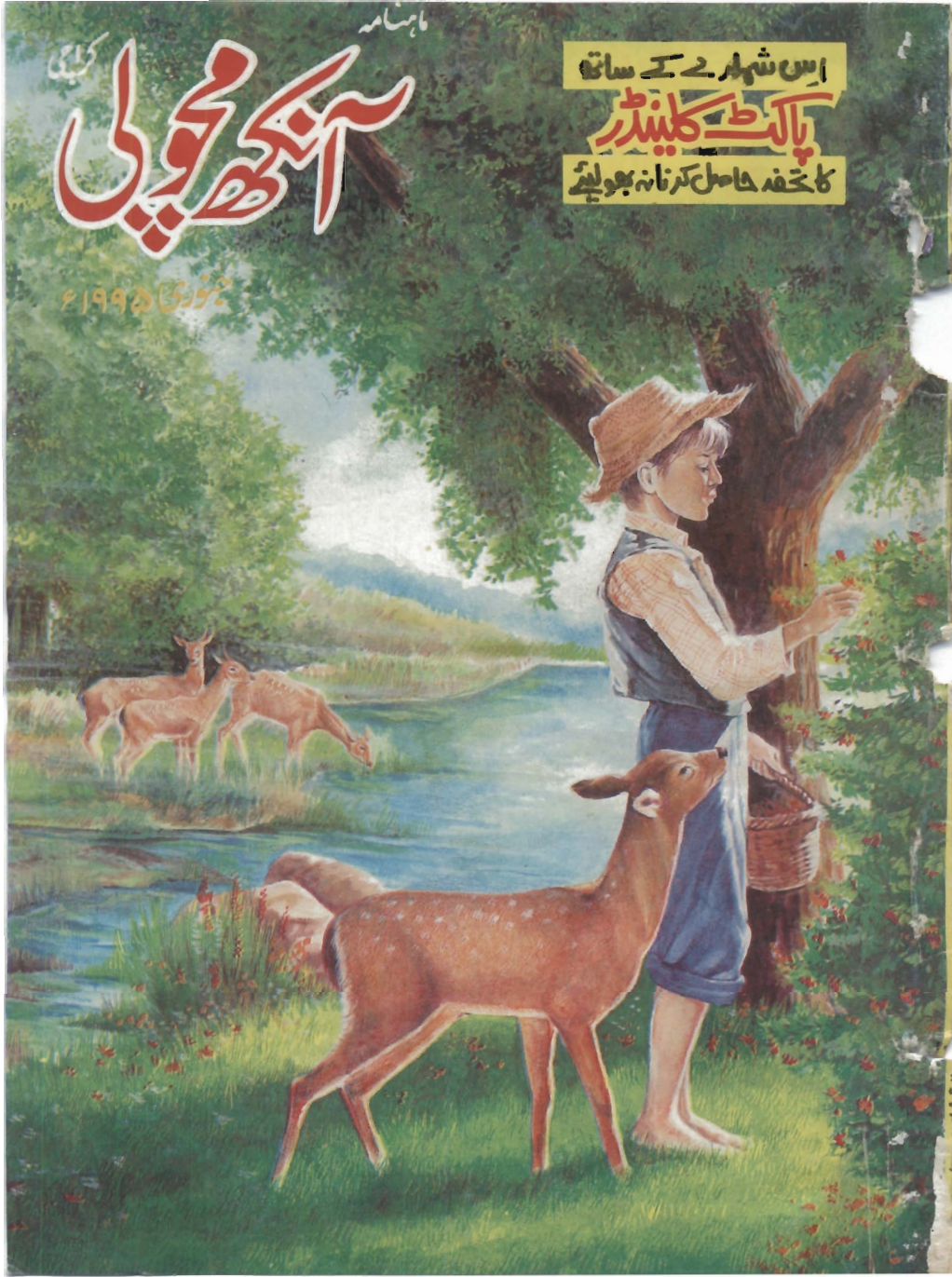

کپڑے ہو جائیں ایک دم برائٹ
جب یہ جائیں سنو وہائٹ

پیارے بچّو!

"سنو وہائٹ" سے کپڑے ڈرائی کلین کرائیں

جدید ترین الیکٹرونک ویڈیو گیم اور..

ہزاروں روپے کے قیمتی انعامات حاصل کریں..

☆ آج ہی اپنی قریبی "سنو وہائٹ" برانچ سے رجوع کریں.

☆ یہ پیشکش صرف کراچی کے لئے ہے.

RANCHES : IN KARACHI
HADURABAD, COMMERCIAL AREA 4933690
A BINORI TOWN 4910521
N ROAD 7722433
PHASE V 5875142
204175
FAISAL 446682
573298
PHASE II 213336
543451
Y ROAD BRANCH. 477714
Centre, Opp. Bar-B-Que
t Clifton- II 5860240
ce Zamzama Boulevard- 539146

Snowhite
DRY CLEANING INDUSTRIES
KARACHI - MULTAN - LAHORE - RAWALPINDI
ISLAMABAD

HEAD OFFICE : 5681723 - 2 LINES
SNOWHITE CENTRE ABDULLAH HAROON ROAD KARACHI 5685124-25-26
MULTAN
KHAN PLAZA QASIM ROAD
MULTAN CANTT. 40538
LAHORE
CARPET CLEANING DIVISION 874366
NO.9, COMMERCIAL ZONE LIBERTY MARKET, GULBARG-III, LAHORE 874933
RAWALPINDI
MALL ROAD OPP. CNTONMENT BOARD, RAWALPINDI. 567988
ISLAMABAD 567088

Adarts-HSU-1/93

تعلیم

قومی ترقی کا ایک اہم ستون!

ملک سے ناخواندگی دُور کر کے فنّی اور پیشہ ورانہ
تعلیم کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ بامعنٰی
تعلیم کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔

حبیب بینک اپنی اسکول بینکنگ اسکیم، اسپانسرڈ
اسکالرشپ اور قرضِ حسنہ اسکیموں کے ذریعے
ملک میں تعلیم کے فروغ کے لئے اپنا بھرپور کردار
ادا کر رہا ہے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۷ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ رجب/شعبان ۱۴۱۵ھ جنوری ۱۹۹۵ء

مدیر اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ

تجمل حسین چشتی

مدیر اعزازی

طاہر مسعود

مجلس ادارت

منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

مصور

مومن رحیم

سرکولیشن مینجر

بابر فاروقی

منیجر اشتہارات

عمران احمد

☆ ☆

قیمت

۱۲ روپے

۷ درہم ۷ ریال

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

خط و کتابت کا پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۰۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ (۷۴۸۰۰) فون: ۴۹۴۸۲۱۰، ۴۹۴۲۸۵۷

ناشر: ظفر محمود شیخ ○ طابع: زاہد علی ○ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی

واہ صلاح الدین

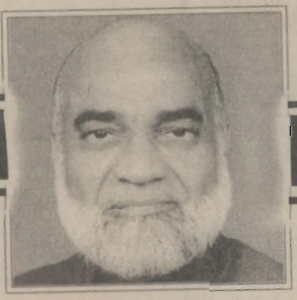

ہمارے ملک کے سب سے سچے اور بے باک صحافی جناب محمد صلاح الدین شہید کر دیئے گئے۔ وہ طویل عرصے سے اپنے قلم کے ذریعے پاکستان کے دشمنوں کے خلاف جہاد کر رہے تھے۔ اور ہر حالت میں سچ کہتے تھے اور سچ لکھتے تھے۔ یہی ان کا جرم تھا جس کی ان کو سزا مل گئی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سزا ان کا انعام ہے پورے ملک میں ان کے قتل پر جس طرح سوگ منایا گیا یہ اعزاز اس سے پہلے کسی صحافی کی موت کے حصے میں نہیں آیا۔ اور پھر شہید ہونے کی وجہ سے انہیں ہمیشہ کی زندگی مل گئی۔ محمد صلاح الدین ایک دردمند دل رکھنے والے مسلمان اور پاکستانی تھے۔ وہ اس ملک کا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس ملک کے بچوں کے ہونٹوں پر خوشی سے بھرپور مسکراہٹ دیکھنا چاہتے تھے اور ان ہی باتوں کے لئے وہ ملک دشمنوں کے خلاف لڑائی لڑتے رہتے تھے۔

انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

اور اس ملک پر اپنی جان نچھاور کر دی۔ ہم ان کی روح کو عقیدت سے سلام کرتے ہیں۔ ان کی روح کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ ان ہی کی طرح سچ کہیں گے اور سچ لکھیں گے۔

سنہرے حروف ـــــ ادارہ ـــــ ۸
ماہِ رواں کی پہلی بات ـــــ اداریہ ـــــ ۹
حمد باری تعالیٰ (نظم) ـــــ آصف وقار آصف ـــــ ۱۰
رسول اللہ کے چہیتے غلام ـــــ شہناز بانو ـــــ ۱۱
بزدل ـــــ محمد عقیل صابر ـــــ ۱۴
کتاب (نظم) ـــــ زاہد الحسن زاہد ـــــ ۲۲
عمل سے زندگی بنتی ہے ـــــ عابد سلطان ـــــ ۲۳
سوتا جاگتا ابوالحسن ـــــ نیّر مسعود ـــــ ۲۸
جو تنہا سجاتے ہیں خوشیوں کے میلے (نظم) ـــــ محمد جاوید خالد ـــــ ۳۴
سوال یہ ہے ـــــ ایاز محمود ـــــ ۳۶
سچ بولنے والے جوتے ـــــ محمد شہزاد حنان کستوری ـــــ ۳۹
چھوٹی سی جنت ـــــ شبانہ عرشی ـــــ ۴۶
نیا سال (نظم) ـــــ ضیغم حمیدی ـــــ ۵۳
اردو کے سب سے بڑے انشاپرداز ـــــ ڈاکٹر اسلم فرخی ـــــ ۵۴
ہنستے ہنستے ـــــ لطائف ـــــ ۵۹
حفاظت اپنی جو آپ کرتا ہے ـــــ م، الف، راشد ـــــ ۶۴
باجی تاجی (نظم) ـــــ افضال عاجز ـــــ ۶۷
دوسرا جسم ـــــ محمد عادل منہاج ـــــ ۶۸
مس تو میں ہوں ـــــ شازیہ فرحین ـــــ ۷۷
نقشے طرح طرح کے ـــــ عباس عالم ـــــ ۸۲
کراچی خون میں ڈوبا ہوا ہے (نظم) ـــــ عبد القادر ـــــ ۸۵
بنام آنکھ مچولی ـــــ خطوں کے جواب ـــــ ۸۶
آمنے سامنے ـــــ سلیم خالق ـــــ ۹۰
جانوروں نے جنگ لڑی ـــــ ۹۴
عکس ادھورے ـــــ ادارہ ـــــ ۹۶
اب میں کیا کروں ـــــ ادارہ ـــــ ۹۸
اور کوّے کی چونچ ٹوٹ گئی ـــــ محمد بن مالک ـــــ ۹۹
فرصت نہیں ہے (نظم) ـــــ عائشہ صدیقہ ـــــ ۱۰۶
وہ کیا راز تھا ـــــ محمد عمر احمد خان ـــــ ۱۰۷
قلم دوست ـــــ ننھی تحریریں ـــــ ۱۱۵

حُسنِ خیال

سنہرے حروف

ساڑھے گیارہ سو برس پہلے اندلسیہ پر بادشاہ حکم حکومت کرتا تھا اس نے دارالخلافہ میں اپنا محل بنانے کے لئے ایک روز زمین کا ایک قطعہ پسند کیا۔ زمین کا یہ قطعہ ایک بوڑھی عورت کی ملکیت تھا۔ بادشاہ نے اس زمین کو حاصل کرنے کے لئے بوڑھی عورت کو منہ مانگی قیمت دینی چاہی لیکن بوڑھی عورت اس زمین کو بیچنے پر راضی نہ ہوئی۔ بادشاہ نے زمین جبراً سرکاری تحویل میں لے لی اور اس پر ایک عالی شان محل بنایا۔

بوڑھی عورت نے اپنا مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش کیا اور اس سے انصاف مانگا۔ انہی دنوں بادشاہ حکم نے قاضی کی دعوت کی تھی۔ قاضی جب دعوت میں گیا تو اپنے ساتھ ایک گدھا بھی لے گیا جس پر خالی بورے لدے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے قاضی کو گدھے کے ساتھ آتے دیکھا تو سخت حیران ہوا۔ قاضی نے بادشاہ سے محل کے باغ سے مٹی کے کچھ بورے بھر لینے کی اجازت مانگی۔ یہ فرمائش سن کر بادشاہ حیران تو ہوا لیکن اجازت دے دی قاضی نے کچھ بورے مٹی سے لبالب بھر لئے پھر بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ مٹی کا ایک بورا اٹھا کر گدھے پر لادنے میں اس کی مدد کریں۔ بادشاہ کو اس درخواست پر ہنسی آگئی خیر اس نے مٹی کا بورا اٹھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ دیکھ کر قاضی نے کہا۔

"جہاں پناہ! اگر آپ یہاں مٹی کا ایک بورا بھی نہیں اٹھا سکتے تو روز قیامت جب اللہ آپ کو حکم دے گا کہ وہ تمام زمین جو تم نے زبردستی حاصل کی ہے اٹھا کر اس کی مالکہ کو واپس کرو تو آپ ساری زمین کو کس طرح اٹھائیں گے؟"

بادشاہ قاضی کے یہ جملے سن کر سخت نادم ہوا۔ اسی وقت بوڑھی عورت کو بلایا اور اس سے کہا۔ "مجھے معاف کر دو اماں! آج سے یہ محل اور باغ تمہارا ہے!!"

ماہِ رواں کی پہلی بات

نیا سال آ گیا۔

سال کے بارہ مہینے گزر گئے ۔۔۔ اور ان مہینوں کو تو گزرنا ہی تھا۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ اس گزرے ہوئے وقت سے کس نے کیا حاصل کیا۔ جن ساتھیوں نے پچھلے سال کی ابتدا ہی پر منصوبہ بندی کر لی تھی اور پھر اس کے مطابق انہوں نے اپنا وقت گزارا، ان کے لئے یقیناً یہ سال بہت اچھا رہا ہو گا۔ لیکن جن دوستوں نے اس ایک سال کے دوران کوئی کامیابی حاصل نہیں کی ۔۔۔ کوئی ایسی کامیابی جسے وہ فخر سے دوسروں کو بتا سکیں۔ ان کے لئے تو یہ سال سمجھو ضائع ہی ہوا۔ گویا ان کی زندگی میں اس سال کا آنا اور نہ آنا برابر ہی رہا۔

اصل میں کامیابی کوئی سکہ نہیں جو رستے میں پڑی مل جائے۔ کامیابی کے لئے منصوبہ بندی اور محنت کرنی پڑتی ہے ۔۔۔ چنانچہ اگر آپ ایک کامیاب انسان بننا چاہتے ہیں تو پھر آپ آج ہی سے اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا شروع کر دیجئے۔ جو وقت گزر گیا اور ضائع ہو گیا، اسے بھول جائیے۔ آپ کی نظریں مستقبل پر جمی ہونی چاہئیں۔

نئے سال کے لئے آپ کی منصوبہ بندی کیا ہو؟

اس بارے میں بہتر فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں ۔۔۔ آپ اپنی شخصیت اور اپنے معاملات کا جائزہ لیجئے۔ آپ کو یقیناً ان میں کوئی نہ کوئی کمی اور خامی نظر آئے گی۔ آپ اس کمی کو دور کرنے کا عزم کر لیجئے۔ آپ کا عزم یہ ہونا چاہئے کہ اس ایک سال کے اندر اندر آپ یہ کام ہر صورت میں کر لیں گے۔ اور جب آپ ایک مرتبہ طے کر لیں تو پھر اس کام کو پورا کرنے میں زور و شور سے لگ جائیں کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی آپ کے قدم نہ چومے۔ اور اگلے سال آپ اسے اپنی ایک کامیابی کے طور پر دوسروں کو نہ سنا سکیں۔ یاد رکھئے ۔۔۔ کامیابی کے لئے مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور مستقل مزاجی کے معنی ہیں اپنے لئے جو ڈھنگ ایک مرتبہ آدمی نے مقرر کر لیا ہو اسی ڈھنگ اور طریقے پر قائم رہے۔ جب قطرہ قطرہ ٹپکنے والا پانی پتھر کی سل میں سوراخ کر سکتا ہے تو آپ کی کوششیں دوسروں کی نظروں میں آپ کو سرخرو کیوں نہیں کر سکتیں ؟

آپ کا دوست
طاہر مسعود

حمد باری تعالیٰ

آصف وقار آصف

لائق حمد بس وہی رب ہے
جس کی قدرت میں ہے یہاں ہر شے

روز و شب صبح و شام ہیں اس کے
سارے عالم میں کام ہیں اس کے

پتے پتے میں اس کی رنگت ہے
پھول کلیوں میں اس کی نکہت ہے

ذرّہ ذرّہ ثنا میں اس کی مگن
قطرے قطرے میں ہے اسی کی لگن

بے نیازی میں اپنی بالا ہے
اس کی بخشش کا رنگ نرالا ہے

رحمتوں میں کمی نہیں اس کی
دھڑکنوں تک رسائی ہے اس کی

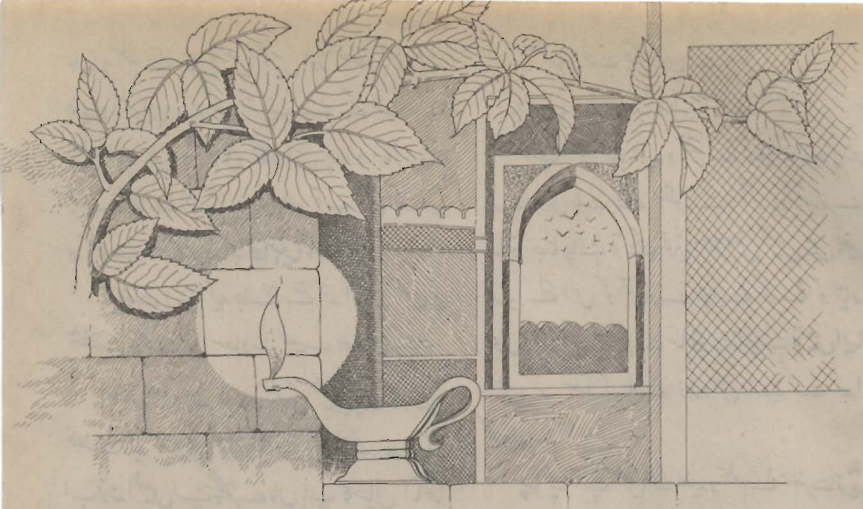

رسول اللہ کے چہیتے غلام

شہناز بانو

عرب کی چلچلاتی گرمی اور تپتی ریت پر کچھ اونٹوں کا قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اسی قافلے میں پانچ افراد کا ایک کنبہ بھی شامل تھا۔ باپ حارثہ ماں سعدی اور ان کے تین بچے اسما، جبہ اور زید۔

یکایک بنی قین بن جسر کے کچھ شرپسندوں نے قافلے پر چھاپہ مارا اور دوسرے مال واسباب کے ساتھ زید کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔

اپنے لختِ جگر کے چھن جانے سے بد نصیب ماں سعدیٰ کی دنیا تو اندھیر ہو ہی گئی تھی، باپ بھی اس رنج والم میں دیوانہ ہو گیا۔ اور اس دیوانگی میں اس نے بستی بستی، قریہ قریہ اور کوچہ کوچہ چھان مارا مگر بیٹے کا کوئی پتا نہ ملا۔

دوسری جانب زید کو لٹیرے ان کے شفیق ماں باپ کی آغوش سے چھین کر عکاظ کے بازار میں لے گئے، جہاں انسانوں کی منڈی لگتی تھی اور لے جا کر بیچ دیا۔

خریدنے والے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بھتیجے حکم بن حزام تھے، جنھوں نے ان کی قیمت چار سو درہم ادا کی اور لے جا کر اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کی خدمت اقدس میں پیش کر دیا۔

جب حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لے گئے تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اس پندرہ سال کے بھولے بھالے لڑکے پر پڑی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے انہیں مانگ لیا۔

حضرت زیدؓ کیا جانتے تھے کہ انہیں کس کی شفقت و محبت کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفیق پناہ گاہ میں حضرت زیدؓ ساری دنیا کو فراموش کر بیٹھے، حد یہ کہ اب تو نہ انہیں اپنے بچھڑے ماں باپ کا خیال آتا تھا اور نہ بہن بھائی کا۔

اسی زمانے میں بنو کلب کے چند افراد حج ادا کرنے کے لئے مکہ آئے، جب ان کی نگاہ حضرت زیدؓ پر پڑی تو وہ چونک پڑے اور انہوں نے حضرت زیدؓ کو حارثہ کے بچھڑے بیٹے کی حیثیت سے شناخت کر لیا، اور واپس جا کر ان کے والد کو اطلاع دی کہ مکہ میں تمہارا بیٹا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں ہے۔

ان کے والد نے جب اپنے بچھڑے بیٹے کی اطلاع سنی تو تڑپ اٹھے اور فوراً مکہ روانہ ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ اور بے تحاشہ روتے ہوئے فریاد کی۔

"میرا لخت جگر مجھے لوٹا دیں اس کی آزادی کے لئے تو میں اپنی ساری متاع بھی دینے کے لئے تیار ہوں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دیتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا لخت جگر کون ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "زیدؓ"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو زید پسند کرے وہی بات مجھے منظور ہے، اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں میں بغیر فدیہ لئے اس کو تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں، اور اگر وہ میرے ساتھ رہنا چاہے تو میں ایسا نہیں کر سکتا کہ اسے زبردستی اپنے سے جدا کروں۔"

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو بلایا اور ان سے کہا۔

"یہ تمہارے والد اور چچا ہیں اور تم کو لینے آئے ہیں اگر تم ان کے ساتھ جانا چاہتے ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے پر حضرت زیدؓ نے آگے بڑھ کر والد کو سلام کیا، جواب میں انہوں نے آگے بڑھ کر حضرت زیدؓ کو سینے سے لگا لیا اور اس قدر روئے کہ داڑھی تر ہو گئی۔

تب حضرت زیدؓ نے جواب دیا۔

"میرے آقا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا اللہ مجھے اپنے قدموں سے جدا مت کیجئے۔"

یہ جواب سن کر ان کے والد حیران رہ گئے اور بولے۔ "زید تم آزادی پر غلامی کو ترجیح دے رہے ہو۔"

اپنے والد کے منہ سے یہ بات سن کر حضرت زیدؓ بولے۔

"میرے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھ پر اس قدر مہربان ہیں کہ حقیقی والدین بھی اپنی اولاد پر اس قدر مہربان نہیں ہوتے اس لئے ان کی غلامی پر میں ہزار آزادیاں قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

حضرت زید کا جواب سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ خوش ہوئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اسی وقت خانہ کعبہ تشریف لے گئے اور سب کے سامنے ارشاد فرمایا۔

"لوگو! گواہ رہنا کہ زید آج سے میرا فرزند ہے میں اس کا وارث ہوں اور یہ میرا وارث ہوگا۔"

حضرت زیدؓ کے والد نے یہ سب کچھ دیکھا تو انہیں سخت حیرت اور مسرت ہوئی اور وہ مطمئن ہو کر اپنے وطن لوٹ گئے۔

اس واقعہ کے بعد مکہ کے لوگ حضرت زیدؓ کو زید بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہنے لگے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ کو اس قدر چاہتے تھے کہ وہ لوگوں میں حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

یہ نبوت کا دسواں سال ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ کو ہمراہ لے کر طائف شہر تبلیغ حق کے لئے روانہ ہوئے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ طائف کے لوگ رحمت العالمین کے لئے دیدہ و دل بچھا دیتے مگر اس کے برعکس انہوں نے اللہ کے محبوب نبیؐ کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا۔

طائف کے لوگوں نے کچھ اوباش اور غنڈے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جدھر تشریف لے جاتے یہ لوگ وہاں پہنچ جاتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آوازے کستے، تالیاں پیٹتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر بے تحاشا پتھر برساتے۔

حضرت زیدؓ اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈھال بنا لیتے ان کی کوشش یہی ہوتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آنے والے پتھر کو اپنے اوپر لے لیں۔ اور وہ پتھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ لگے آخر طائف میں قیام کے دسویں روز ان ظالموں کے مظالم کو برداشت کرنے کی حد ہو گئی۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اتنے شدید زخمی ہو گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے مبارک خون سے بھر کر اتنے وزنی ہو گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قدم نہیں اٹھا پا رہے تھے۔ حضرت زیدؓ بھی زخموں سے چور تھے۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوروں کے ایک باغ میں پناہ لی۔ حضرت زیدؓ نے اپنی چادر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر سے زخموں کو صاف کیا باغ میں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد آپ لوگ مکہ واپس آ گئے۔

ہجرت سے چند سال پہلے کا واقعہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔

"جو شخص کسی جنتی عورت سے نکاح کرنا چاہے اسے ام ایمن سے نکاح کرنا چاہئے۔" ام ایمنؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آیا تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بہت تعظیم فرماتے تھے۔

حضرت زیدؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی خاطر حضرت ام ایمن سے نکاح کر لیا حالانکہ وہ حضرت زیدؓ سے عمر میں کافی بڑی تھیں۔

حضرت ام ایمنؓ کے بطن سے آپ کے ہاں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ جن کا نام حضرت اسامہ بن زیدؓ ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہؓ سے بھی بے پناہ محبت رکھتے تھے اور وہ بھی حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ہجرت کے ۵ ماہ بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انصار اور مہاجرین کے درمیان مواخاۃ قائم کی تو حضرت زیدؓ کو قبیلہ عبدلاشہل کے رئیس حضرت اسید بن مغیرؓ انصاری کا دینی بھائی بنا دیا۔

۴ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بن جحش کا نکاح حضرت زیدؓ سے کر دیا۔ اور حضرت زینبؓ کا مہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کی جانب سے خود ادا کیا۔

حضرت زینبؓ صرف ایک سال حضرت زیدؓ کے نکاح میں رہیں لیکن کچھ حالات ایسے ہوئے کہ دونوں کا نباہ نہ ہو سکا اور حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی جب حضرت زینبؓ کی عدت پوری ہو گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منشائے الٰہی سے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیا۔ اس طرح حضرت زینبؓ ام المومنین میں شمار ہوئیں۔

اس نکاح پر منافقین یہودی، اور مشرکین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انتہائی فضول اور بیکار باتیں بنائیں۔ ان کی شر انگیزی کی بنیاد یہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو بہو کو حرام قرار دیتے ہیں پھر انہوں نے اپنے بیٹے زیدؓ کی مطلقہ بیوی سے کیونکر نکاح کر لیا ان کی اس فتنہ پردازی کا جواب قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یوں دیا۔

"(لوگو) محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خاتم النبیین ہیں۔"

اور سورہ احزاب میں مزید ارشاد ہوا۔

"منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔"

"اس واضح حکم کے بعد لوگ حضرت زید کو زید بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے زید بن حارثہ

کہنے لگے اور جاہلیت کا یہ خیال ہمیشہ کے لئے باطل ہو گیا کہ منہ بولا بیٹا بھی حقیقی بیٹے کی طرح ہوتا ہے۔

حضرت زیدؓ کی سیرت کی خاص بات ان کا جذبہ شوق جہاد تھا وہ ایک ماہر تیر انداز اور مشاق تلوار باز تھے۔

ہجرت کے بعد غزوات اور سریہ کا سلسلہ شروع ہوا تو غزوہ بدر سے لے کر جنگ موتہ تک تمام غزوات میں نہایت پا مردی سے داد شجاعت دی۔

غزوات میں شرکت کے علاوہ حضرت زیدؓ کو سات فوجی مہمات میں قیادت کا شرف بھی حاصل ہوا۔

حضرت زیدؓ نے غزوہ موتہ میں شہادت کا درجہ حاصل کیا۔ ان کی شہادت کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

"یہ میرے بھائی میرے مونس اور مجھ سے بات چیت کرنے والے تھے۔"

حضرت زیدؓ کی کم سن صاحبزادی کو روتا دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی رقت طاری ہو گئی اور شدت غم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر روئے کہ آپ کی آواز رک گئی۔ حضرت سعدؓ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کیا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

"یہ جذبہ محبت ہے جو ہر محبّ کے دل میں اپنے محبوب کے لئے ہوتا ہے۔"

حضرت زیدؓ نے ۵۱، ۵۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

آپ کو تین اولادیں اللہ تعالیٰ نے عطا کیں۔ جن میں دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

حضرت زیدؓ کو بچپن ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے خود آپ کی تربیت فرمائی تھی اس لئے حضرت زیدؓ دین و دنیا میں ہمیشہ اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

عجز و انکساری طبیعت کا خاصہ تھی۔ حضرت زیدؓ نے ہمیشہ اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں پیوند لگے کپڑے پہنے اور اپنے جوتے بھی خود مرمت کئے۔ غذا میں اکثر جو کی روٹی کھاتے جو کبھی پانی اور کبھی دودھ میں بھگو کر استعمال کی۔

حضرت زیدؓ کو عبادت سے بھی خاص شغف تھا۔ رات کو اکثر کم سوتے تھے زیادہ تر وقت عبادت میں گزارتے تھے۔

آپ مہمانوں کی تواضع کرتے مسکینوں اور یتیموں کی خدمت اپنا فرض سمجھ کر کرتے تھے۔

غرضیکہ آپ کی پوری زندگی اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ تھی۔ اور حضرت زیدؓ کے یہی اوصاف تھے جس کی وجہ سے آپؐ رحمت العالمین محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے بیٹے کی طرح ہو گئے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بزدل

محمد عقیل صابر

میں گھر کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ لیکن مجھے گھر پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میرے فوٹو گرافر دوست فیروز جمشید کو مجھ سے ملنے کے لئے میرے گھر آنا تھا۔ لیکن ابھی اس کے آنے میں کافی دیر تھی۔ چنانچہ میں گھر جاتے وقت راستے میں شاہ بابا کے کیفے میں رک گیا۔ شاہ بابا اس وقت کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔

"چائے پیو گے؟" شاہ بابا نے میرے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"نہیں! اس وقت کچھ پیاس سی لگ رہی ہے، پانی پلا دیں۔" میں نے فرمائش کی۔

اس دوران ان کا پوتا اندر آ گیا۔ اس کی عمر مشکل سے سترہ اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ وہ کیفے کے کاموں میں ان کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتا تھا۔ لڑکے کے پہلو میں چھوٹا سا ریڈیو کیسٹ پلیئر جھول رہا تھا ہیڈ فون اس نے کانوں سے اتار کر گلے میں لٹکایا ہوا تھا ان دنوں شاذ و نادر ہی کوئی نوجوان اس سیٹ کے بغیر دکھائی دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نوجوان

نے اگر ہیڈ فون کانوں میں نہ چڑھایا تو اسے ٹھنڈ لگ جائے گی۔

"شاہ بابا! پوتا آپ کے ساتھ ٹھیک چل رہا ہے نا؟"

"ہاں! بہت اچھا لڑکا ہے۔" شاہ بابا نے جواب دیا۔ "میرے بہت کام آتا ہے۔ ضرورت کے وقت اسے بلانا بھی آسان رہتا ہے۔ کیونکہ میں اسی عمارت میں اوپر رہتا ہوں۔ کبھی کبھار مجھے کہیں جانا ہوتا ہے تو یہ سارا کام سنبھال لیتا ہے۔"

"کچھ خاموش اور بجھا بجھا سا نظر آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں باپ کی موت کے بعد سے کچھ چپ چپ سا رہنے لگا ہے۔"

"باپ کی موت؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! اس عمارت کے اوپر آگ لگ گئی تھی۔ اس نے گھبراہٹ میں چھٹی منزل سے چھلانگ لگا دی ..... بیٹے کو عمارت میں ہی چھوڑ کر۔ بعد میں پتا چلا کہ اس نے خواہ مخواہ بد حواسی میں جان دی۔ صورت حال اتنی خطرناک نہیں تھی جتنی وہ سمجھ رہا تھا۔ بیٹا بعد میں بہ حفاظت نکل آیا۔" ایک لمحے کے وقفے کے بعد شاہ بابا نے پھر پوچھا۔ "چائے تو نہیں پیو گے نا؟"

"نہیں! دراصل میں کچھ جلدی میں ہوں۔ ایک فوٹو گرافر دوست سے میری ملاقات طے ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اور تھوڑی دیر بعد اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس رات جب فیروز جمشید میرے گھر مجھ سے ملنے آیا تو وہ خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے ..... تم اتنے نروس کیوں ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مغموم لہجے میں بولا۔ "کل رات کسی نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"آخر ہوا کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"پہلے تو مجھے یہ خط ملا۔" اس نے لفافہ میری طرف بڑھایا۔ اندر ایک مختصر سے پرزے پر لکھا تھا۔ "تم مرنے والے ہو۔" پیغام پڑھ کر میں نے فیروز جمشید کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ "یہ مجھے پچھلے جمعہ کو ملا تھا۔ اس کے بعد کل رات میں اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑا تھا کہ مجھ پر کسی نے گولی چلائی۔ گولی مجھ سے صرف تین انچ کے فاصلے سے دیوار پر آ کر لگی۔"

"تم پر گولی چلائی گئی! تمہیں یقین ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں میں مذاق کر رہا ہوں۔" وہ گویا برا مناتے ہوئے بولا۔

"پولیس والوں نے کیا خیال ظاہر کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں نے پولیس میں رپورٹ نہیں کی۔ کیونکہ آج کل تو خود پولیس پر اس قسم کے حملے عام

ہیں۔" وہ مضطرب لہجے میں بولا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ کوئی فیروز جمشید کی جان کا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن میں فیروز جمشید کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف بھی نہیں تھا۔ اس کے بارے میں میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک ماہر فوٹو گرافر تھا اور اچھی تصویر کی تلاش میں ہر وقت کیمرہ گلے سے لٹکائے رکھنا اس کی پرانی عادت تھی۔ ایسی تصویروں کی صحافت کے پیشے میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ پھر کچھ دیر تو ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، اس کے بعد ایک بار پھر اس پر غمزدگی کا دورہ پڑ گیا۔ اچانک وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اور وہ "کلک" کی آواز اس نے تو میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔"

"کون سی کلک کی آواز؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں نے تمہیں اس کے بارے میں نہیں بتایا؟" وہ قدرے پرسکون آواز میں بولا۔ "رات مجھ پر فائر ہوا تو اس کے فوراً بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو صرف کیمرے کی کلک کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بالکل صاف اور واضح آواز تھی جیسے میرے عین سامنے تصویر کھینچی جا رہی ہو۔ اور اس آواز میں گویا خوف زدہ کر دینے والا کوئی پیغام پوشیدہ تھا۔"

یہ واقعی عجیب غریب معاملہ تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس موقع پر اس کی تسلی کے لئے میں کیا کہوں۔ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے رات کے تقریباً بارہ بج گئے۔ فیروز جمشید ایک بار پھر مضطرب اور پریشان نظر آنے لگا۔ وہ رخصت ہونے لگا تو میں اس کی پریشانی کے خیال سے اسے اس کے فلیٹ تک چھوڑنے کے لئے ہمراہ ہو لیا۔

اپنے فلیٹ پر پہنچ کر فیروز جمشید نے مجھے چائے کی دعوت دے دی۔ اس کا فلیٹ عمارت کی چھٹی منزل پر تھا۔ چنانچہ وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ چائے بنانے کے دوران اچانک فیروز جمشید کو خیال آیا کہ وہ ٹیلی فون سے منسلک ریکارڈنگ مشین کو چیک کر لے کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی پیغام تو ریکارڈ نہیں ہوا۔ اس نے بٹن آن کیا تو چند لمحوں کی خاموشی کے بعد صرف ایک مختصر سا پیغام سنائی دیا۔ اور وہ تھا "کلک"۔ اس واضح اور صاف آواز کے پس منظر میں ٹریفک کا ہلکا سا شور بھی سنائی دیا۔ پھر سکوت چھا گیا فیروز جمشید اپنی جگہ بت بن کر رہ گیا اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے فیروز جمشید کا بازو پکڑ کر ہلایا تب وہ چونکا اور بہ مشکل اس قابل ہوا کہ میرے ساتھ باہر چل سکے۔

ذرا سی چہل قدمی کے بعد ہمیں پھر چائے کی طلب ہونے لگی۔ رات کے اس پہر صرف شاہ بابا کا کیفے ہی کھلا تھا۔ ہم اندر چلے گئے۔ کاؤنٹر پر شاہ بابا کے روٹھے روٹھے سے پوتے کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔ اس کا چھوٹا سا ریڈیو کاؤنٹر پر رکھا تھا۔ جس کے ساتھ ٹیپ ریکارڈ بھی منسلک تھا۔ ریڈیو بج رہا تھا۔ ہم کھڑکی کے قریب جا بیٹھے اور ادھر

زدہ تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دینے کے لئے کہا کہ "جو لوگ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں وہ اتنے لمبے چکروں میں نہیں پڑتے کہ فون پر کیمرے کی "کلک" سنوائیں۔ اس شخص کا مقصد تو تمہیں صرف خوفزدہ کرنا ہے۔"

"لیکن کیوں؟" اس نے جاننا چاہا۔

"کوئی ایسی بات ہے جس کا تعلق تمہارے کام سے ہے۔ اسی لئے تمہیں کیمرے کی کلک سنوائی جا رہی ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا فیروز جمشید کی بالکونی میں فائر کرنے کے لئے فائر کرنے والے کا بھی بلندی پر ہونا ضروری تھا۔ ورنہ اس طرح سیدھ میں فائر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں ان ہی سوچوں میں الجھا فیروز جمشید کو ساتھ لے کر اٹھا اور ادائیگی کرنے کے لئے کاؤنٹر پہ پہنچا۔ شاہ بابا کا پوتا ہمیں بقایا دینے میں مصروف ہوا تو میں نے یونہی سرسری انداز میں اس کا ریڈیو ٹیپ ریکارڈر اٹھا لیا میں نے ریڈیو کے بجائے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آن کیا تو لڑکا اسے واپس لینے کے لئے جلدی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو ..... اسے خراب مت کر دینا۔"

"اب میں اتنا اناڑی بھی نہیں ہوں۔" میں نے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ اور ٹیپ ریکارڈر کا پلے بٹن دبا دیا۔ کیسٹ ایک لمحے کے لئے خاموشی سے گھومی پھر "کلک" کی ایک خاصی بلند

سے پیسے گر پڑے اور وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتا ہوا دیوار سے جا لگا۔

"یہ ..... یہ کیا .....؟" فیروز جمشید حیرت سے بولا۔

"کسی کو خوف زدہ کرنے کا یہ نہایت آسان طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔ اس کے علاوہ یہ لڑکا بھی چھٹی منزل پر رہتا ہے۔ اس کے فلیٹ کی بالکونی تمہاری بالکونی کی سیدھ میں پڑتی ہے۔ درمیان میں صرف سڑک حائل ہے۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔

فیروز جمشید بیٹھی بیٹھی آواز میں بولا۔ "لیکن اس نے ایسا کیوں کیا۔ میری تو اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"میری سمجھ میں بھی یہ بات اب آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں جب تمہارے فلیٹ آیا تھا تو میں نے تمہارے بیڈ روم میں ایک تصویر دیکھی تھی کہ ایک عمارت کی بالائی منزل پر آگ لگی ہوئی ہے اور ایک شخص نے موت کے خوف سے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی ہے۔ مجھے اب یاد آیا کہ اس تصویر میں جس عمارت کا سامنے کا حصہ دکھائی دے رہا تھا وہ یہی عمارت ہے۔ جس میں ہم کھڑے ہیں ....."

"ہاں ..... ہاں ..... مجھے یاد آ گیا۔" فیروز

ہی بن گئی تھی اور اخبار میں شائع بھی ہوئی تھی"۔

"لیکن اس لڑکے کے لئے وہ تصویر شاہکار نہیں تھی۔" میں نے تاسف سے کہا۔ "وہ اس کے باپ کی تصویر تھی اور ہر بچے کی نظر میں اس کا باپ ایک بہادر آدمی ہوتا ہے۔ ہیرو ہوتا ہے۔ اس کے لئے یہ بات بڑے صدمے کی تھی کہ اس کے باپ نے اسے فلیٹ میں چھوڑ کر جلتی ہوئی عمارت سے چھلانگ لگا دی تھی۔ اور تمہارا قصور یہ تھا کہ تم نے اس منظر کو کیمرے میں محفوظ کر لیا اور پھر اسے اخبار میں شائع کرا دیا۔ اور اسی وجہ سے اس کے دل میں تمہارے خلاف نفرت اور غصہ بھر گیا۔ تمہاری وہ شاہکار تصویر اس کی نظر میں بہت بدصورت تھی۔" پھر میں نے کاؤنٹر کی طرف مڑتے ہوئے کہا "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا دوست؟"

لڑکا جواب دینے کے بجائے عقبی دروازے کی طرف دوڑ پڑا لیکن شاہ بابا جاتے وقت اسے مقفل کر گئے تھے۔ وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا مقصد تمہیں نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ کیوں فیروز؟"

"ہاں ..... ہاں ..... بالکل، بالکل ٹھیک ہے....." فیروز جمشید نے ہونقوں کی طرح سر کیا۔ میں اسے سوچنے سمجھنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ سوچنے سمجھنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ ہنگامی سیڑھیوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

"پولیس اور ایمبولنس کو فون کرو۔" میں نے چلا کر فیروز جمشید سے کہا۔ "اور دروازے کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ شاید یہ واپس آجائے۔"

میں لڑکے کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ اگر وہ اپنے اپارٹمنٹ میں گھس کر دروازہ بند کر لیتا تب بھی غنیمت تھا۔ لیکن وہ چھت کی طرف چڑھتا ہی چلا گیا۔

چھت پر پہنچنے کے بعد اس کے سامنے کہیں جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں آخری سیڑھی پر رک گیا اور وہ آگے بڑھتے ہوئے چلایا۔

"میرے قریب مت آنا۔"

"دوست! ڈرو مت کوئی بھی تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ اسے باتوں میں الجھائے رکھوں۔

"دیکھو دوست.....!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"مجھے دوست مت کہو۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے پہلے سے زیادہ ملائمت سے کہا۔
لیکن یہ بات اس نے گویا سنی ہی نہیں۔ وہ چھت کے کنارے سے نیچے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دور کہیں سے سائرن کی آواز سنائی دی۔ لڑکے نے ایک بار پھر جھانکا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ لڑکے کو ایک بار پھر باتوں میں لگانے کے لئے میں نے سرسری لہجے میں پوچھا: "جس گن سے تم نے فیروز پر فائر کیا تھا وہ کس کی تھی؟"

"میرے ابو کی۔"

میں نے نہایت ہوشیاری سے ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ فوراً چلایا۔
"آگے مت بڑھنا۔"

"دیکھو دوست ...... فیروز کا مقصد تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں تھا۔ وہ تو ......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا کیونکہ وہ میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ سائرن کی آواز تیزی سے قریب آرہی تھی۔ اور وہ عین چھت کے کنارے سے نیچے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ چھلانگ لگانے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔ عین اسی وقت مجھ میں بجلی کی سی پھرتی آگئی اور میں پوری قوت سے اس کی طرف بھاگا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا میں نے چھلانگ لگا کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"چھوڑو مجھے ــــ" وہ چیخا اور اپنے آپ کو چھڑانے لگا۔

"کیا تم بھی اپنے باپ کی طرح بزدل ہو۔ کیا تم بھی اسی طرح اپنی جان دینا چاہتے ہو جس طرح تمہارے باپ نے جان دی"۔ میں نے اس کے کانوں میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔ یہ سن کر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی مزاحمت کمزور پڑ گئی اور اس نے اپنے آپ کو آہستہ آہستہ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ یقیناً وہ ایک بہادر لڑکا تھا اور بزدلی سے نفرت کرتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس اوپر آگئی۔

اگلی دوپہر فیروز شاہ نے میرے کہنے پر اس لڑکے کے سامنے اپنی شاہکار تصویر کو آگ لگا دی۔ جب تک تصویر جلتی رہی، لڑکے کے چہرے پر عجیب سا اضطراب رہا لیکن تصویر کے راکھ ہوتے ہی اس کے چہرے پر سکون چھا گیا۔ افسوس کہ فیروز شاہ نے اس پرسکون چہرے کی تصویر نہیں بنائی۔ کیونکہ ایسی تصویریں اخباروں میں نہیں چھپتیں۔

انعام کس کو ملا؟

"ذرا پہچانئے تو"، دسمبر میں شائع ہونے والی تصویر کو اکثریت نے بآسانی پہچان لیا۔ جی ہاں! یہ اسکواش کے بے تاج بادشاہ "جہانگیر خان" تھے۔
ہمیں اس سلسلے میں سینکڑوں ساتھیوں کے درست جوابات موصول ہوئے۔ تین خوش نصیب ساتھی جو بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حقدار قرار پائے، درج ذیل ہیں:۔

- عروج کنول، کراچی
- منوج کمار بجانی، حیدر آباد
- اظہر خان، کراچی

کتاب

زاهدالحسن زاهد

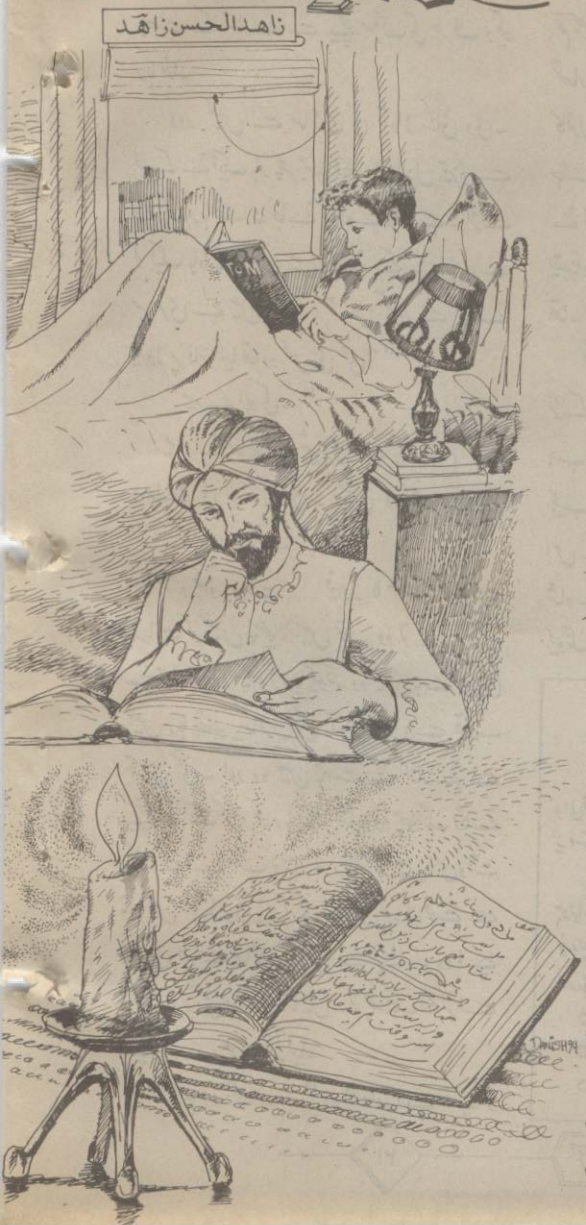

کتابیں ہی ساتھی ہیں تنہائی کی
دلوں کو ملے ان سے ہی روشنی

مجھے جاں سے پیاری ہے میری کتاب
یہ رکھتی نہیں کوئی اپنا جواب

پڑھے دل لگا کر جو اس کو بشر
سکھاتی ہے اس کو یہ علم و ہنر

دکاں ہے جواہر کی میری کتاب
محبت مجھے اس سے ہے بے حساب

یہ نامی گرامی ادیبِ شہیر
رہے ہیں کتابوں کے وہ بھی اسیر

اگر تم بھی چاہو کہ پیدا ہو نام
کتابوں کا دل سے کرو احترام

کتابوں سے دولت ملے علم کی
سنورتی ہے ان سے سدا زندگی

کتابیں بناتی ہیں نیک اور خلیق
کتابیں ہیں انساں کی سچی رفیق

بُری صحبتوں سے ہے بہتر کتاب
اندھیروں میں بنتی ہے رہبر کتاب

سے زندگی بنتی ہے

عابد سلطان

جلال بھی عجیب لڑکا تھا۔ ہر وقت خاموش رہتا ..... خاموش، کھویا ہوا اور اداس۔ اپنے کلاس فیلوز کی طرح وہ نہ تو شرارتیں کرتا، نہ کلاس میں اودھم مچاتا اور نہ ہی کسی سے لڑتا جھگڑتا۔ بالکل اللہ میاں کی گائے۔ باقی لڑکے اسے چھیڑتے، تنگ کرتے، لیکن وہ کسی سے نہ الجھتا۔ شاید وہ کسی قدر بزدل تھا یا شاید کوئی اور بات تھی۔

مجھے وہ اپنی خاموش طبیعت اور شرافت کے سبب اچھا لگتا تھا لیکن زیادہ نہیں۔ کیونکہ وہ نالائق اور غبی بھی تھا۔ اس کی کاپیاں گندی ہوتیں، اکثر کتابیں لانا بھول جاتا۔ ہوم ورک بھی ٹھیک طرح سے نہیں کرتا تھا۔ اس کی اردو البتہ بہت اچھی تھی۔ خاص کر نظمیں وہ بہت صحیح طریقے سے پڑھتا۔ میں اکثر اسے شوق سے پڑھنے اور ہوم

ورک ٹھیک کرنے کی نصیحتیں کیا کرتا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جیسے وہ میری باتیں سن ہی نہیں رہا ہو۔ جب میں اس سے کہتا کہ تم پڑھائی اور ہوم ورک میں اپنے ابو سے مدد کیوں نہیں لیتے تو وہ جواب میں کچھ نہ کہتا۔ خاموش سر جھکائے کھڑا رہتا۔

پھر امتحانات شروع ہوئے۔ نتیجہ آ گیا ساری کلاس میں صرف تین لڑکے فیل ہوئے تھے۔ ان میں ایک جلال تھا۔ مجھے اس کے فیل ہونے کا افسوس ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ جلال ایک ذہین اور سمجھدار لڑکا ہے۔ اگر وہ پڑھائی اور ہوم ورک پر دھیان نہیں دیتا تو اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوگا۔

جب میں ساری کلاس کو رزلٹ کارڈز دے چکا تو سبھی پاس ہونے والے طلبا کے چہروں پر خوشی اور جوش کے تاثرات تھے لیکن جلال ویسا ہی خاموش بیٹھا ہوا تھا جیسے اسے اپنے فیل ہونے یا پاس ہونے کی پروا ہی نہ ہو۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور تسلی دی۔ اسے محنت کرنے اور شوق سے پڑھنے کی نصیحت کی۔ پھر اسے ذرا غیرت دلانے کے لئے کہا۔

"دیکھو جلال تمہارے یہ سارے کلاس فیلوز اپنی محنت سے پاس ہونے پر آج کتنے خوش ہو رہے ہیں۔ آج جب یہ گھر جا کر اپنے امی ابو کو اپنے پاس ہونے کی خوشخبری سنائیں گے تو وہ کتنا خوش ہوں گے۔ انہیں پیار کریں گے۔ شاباش دیں گے اور اچھے اچھے انعامات لے کر دیں گے۔ تم بتاؤ تم جب اپنے ابو کو اپنا رزلٹ کارڈ دو گے تو وہ کیا کہیں گے؟"

میری بات سن کر وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ لیکن اس کے چہرے پر شدید دکھ کے تاثرات ابھر آئے۔ میں چاہتا تھا کہ اسے احساس دلاؤں تاکہ اسے غیرت آئے اور آئندہ خوب محنت سے پڑھے۔ چنانچہ میں نے پھر پوچھا۔

"بتاؤ نا، تمہارے ابو تمہارے فیل ہونے کا سن کر تمہیں کیا کہیں گے؟"

"سر، سر اس کے تو ابو ہیں ہی نہیں، اس کے ابو تو مر چکے ہیں۔" کلاس کی پچھلی سیٹ سے آواز آئی۔

یکایک جلال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ مجھے شدید دھچکا لگا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو گئی ہے اور میں نے بے خبری کے سبب اس کے معصوم دل کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ میں نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ساری کلاس خاموش تھی۔ جلال سسکیاں بھر رہا تھا، اور اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں اپنی غلطی پر بہت شرمندہ تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب میں جلال کے دکھ کو کیسے کم کروں، اسے کیسے تسلی دوں۔

اچھا تو جلال کی خاموشی، اداسی اور گم سم رہنے کے پیچھے یہ راز تھا۔ اس کے ننھے سے معصوم دل کے لئے یہ غم اتنا بڑا اور شدید تھا جس نے اس کی

ہنسی، شرارتیں اور شوخی سب کچھ چھین لیا تھا۔ اب میں جلال کی نفسیات کو سمجھ گیا تھا۔ اور اسی لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ میں جلال کو اس غم کے بوجھ تلے دبنے اور کچلنے نہیں دوں گا میں اسے اس دکھ کے خول سے باہر نکال کر ایک محنتی، ذہین اور قابل لڑکا بناؤں گا۔

جب چھٹیوں کے بعد اسکول دوبارہ کھلا تو میں نے جلال کو کلاس کا مانیٹر مقرر کیا تاکہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ اکثر اسی سے سبق پڑھواتا، بلیک بورڈ پر سوالات حل کرواتا اور ذرا ذرا سی بات پر خوب شاباش دیتا تاکہ اس میں شوق اور لگن پیدا ہو۔ آہستہ آہستہ اس کی شخصیت میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ میں اسے روزانہ ہوم ورک دیتا اور باقاعدگی سے اس کا ہوم ورک چیک کرتا۔ اکثر اسے اسٹارز دیتا اور کبھی کبھی انعامات بھی دیتا۔ ویک اینڈ کی آخری کلاسوں میں اس سے لطیفے اور نظمیں سنواتا۔ رفتہ رفتہ وہ زیادہ پر اعتماد ہوتا گیا۔ اب اپنے کلاس فیلوز سے بھی وہ زیادہ گھل مل گیا اور کھیل کود میں حصہ لینے لگا۔ کلاس میں بھی توجہ سے سبق سنتا اور ہوم ورک بھی صاف اور باقاعدہ لکھ کر لاتا۔ چند مہینوں میں وہ بالکل بدل گیا۔ میں اس کی اس تبدیلی اور ترقی پر بہت خوش تھا۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ جلال کے والد صاحب آرمی میں تھے اور ابھی جلال بہت چھوٹا سا تھا کہ وہ اپنے ملک کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے بڑا بھائی نہ تھا۔ ایک چھوٹا سا بھائی اور دو بڑی بہنیں تھیں۔ اس کی امی کی ساری توقعات جلال ہی سے وابستہ تھیں۔ ان کی آمدنی بھی بہت کم تھی اور بمشکل گھر کا خرچ چلتا تھا لیکن جلال کی امی چاہتی تھیں کہ جلال کو اچھے اسکول میں تعلیم دلائے تاکہ وہ بڑا ہو کر ایک کامیاب آدمی بنے اور اپنے بھائی بہنوں اور گھر کو سنبھال سکے۔ جلال کے گھر کے حالات جان کر مجھے اس سے اور بھی ہمدردی پیدا ہو گئی اور اس کی امی کے حوصلے اور صبر و استقامت سے بہت متاثر ہوا۔

آٹھویں جماعت کا امتحان قریب آیا تو میں نے ایک دن جلال کو سمجھایا۔

"تمہارے گھر کے حالات ایسے نہیں کہ تم لاپرواہی کرو اور محنت اور پڑھائی سے جی چراؤ۔ تمہارے بھائی، بہنوں اور تمہاری ماں، سبھی کی نگاہیں تم ہی پر جمی ہیں اور سب کی امیدیں تم ہی سے وابستہ ہیں۔ اپنے آپ کو پہچانو اور اَن تھک محنت، جذبے اور لگن سے ان کے خوابوں کو پورا کرو۔"

جلال غور سے میری باتیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری بات سمجھ رہا ہے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی،

"تمہیں اپنے ابو کی جگہ لینی ہے۔ تمہارے ابو ایک بہادر اور حوصلہ مند شخص تھے۔ ان کی روح کو خوش کرنے کے لئے تمہیں بھی ایک بہادر حوصلہ

کام کی باتیں

(۱) انسان کے ارمانوں کی حد کہاں ختم ہوتی ہے؟ اس کی قبر میں۔

(۲) دوستی کی شیرینی کو ایک دفعہ کی رنجش کی یاد ہمیشہ زہر آلود کرتی رہتی ہے۔

(۳) دنیا میں جن چیزوں کی وسعت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، ان میں نیکی سر فہرست ہے۔

مرسلہ:۔ عبدالستار خان طاہر، بورے والا۔

اپنے امتحان کے لئے بہترین تیاری کرو گے اور ہر وقت یہ بات ذہن میں رکھو گے کہ تمہیں اپنی ماں کا خواب پورا کرنا ہے اور اپنے ابو کی جگہ لینی ہے۔"

—○—

آج مجھے جلال کا خط ملا۔ اس کی پوسٹنگ کوئٹہ میں ہوئی ہے۔ ہوا یوں کہ اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تھا۔ اپنے حالات کو سنجیدگی سے سمجھ لیا تھا اور پھر انتھک محنت اور اعلیٰ جذبے کے ساتھ ایک کامیاب اور بڑا آدمی بننے کی کوشش کی تھی۔ آٹھویں کا امتحان اس نے بہت اچھے نمبر لے کر پاس کیا۔ پاس ہوتے ہی اس نے جماعت نہم و دہم کے کورس کا باقاعدہ مطالعہ سال کی ابتدا ہی سے شروع کر دیا اور جب دو سال بعد میٹرک کا امتحان دیا تو اسے اپنی محنت کا پھل مل گیا۔ سارے صوبے میں اس نے دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس نے ویسے ہی محنت جاری رکھی اور ایف کی۔ اسے میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج، دونوں میں داخلہ مل رہا تھا۔ لیکن اس نے کہا کہ میرے ابو آرمی میں تھے۔ اور ملک کے لئے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے اور میں بھی انہی کی طرح آرمی میں جاؤں گا۔ خوش قسمتی سے اس کی یہ آرزو بھی پوری ہو گئی۔ اسے آرمی میں سلیکٹ کر لیا گیا۔ کاکول اکیڈمی سے دو سال کی ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد بطور لیفٹننٹ اس کی پوسٹنگ کوئٹہ میں ہو گئی ہے اور مجھے آج ہی اس کا خط ملا ہے۔

اب جلال کی زندگی سنور گئی ہے وہ انتھک محنت، جذبے اور لگن سے کامیاب ہو کر ایک کامیاب اور خوشحال انسان اور اپنے گھر والوں کے لئے ایک سہارا بن گیا ہے۔ میں اکثر کلاس میں اپنے طالب علموں سے جلال کی محنت اور کامیابی کی یہ داستان سناتا ہوں تاکہ وہ اس سے سبق اور تحریک حاصل کریں اور اب تو آپ نے بھی سن لی ہے۔

انتقال پر ملال

آنکھ مچولی کے سابق مدیر منتظم جناب محمود احمد فاروقی کے والد گرامی انتقال کر گئے

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ

اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے (آمین)

NAZ
DELICIOUS PAN MASALA
جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا.... بتادو نا
ناز
پان مصالحہ
DELICIOUS PAN MASALA
ASHRAF PRODUCTS
P.O. BOX 3546, KARACHI-5 (PAKISTAN)
CABLE: "TWO-IN-ONE"
REPCOM

پہلی قسط

سونا جاگتا ابوالحسن

ابوالحسن ——————— نیر مسعود

اس ماہ سے ہم آپ کے لئے ایک نہایت دلچسپ سلسلہ وار ڈرامہ پیش کر رہے ہیں اس ڈرامے کی کہانی "الف لیلہ" سے اخذ کی گئی ہے۔ "الف لیلہ" داستانوں کی شہرۂ آفاق کتاب ہے اور اس کا ترجمہ دنیا کی اکثر بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ آنکھ مچولی کے اس سلسلہ وار ڈرامے کو اردو کے مشہور ادیب جناب نیر مسعود (لکھنؤ) نے تحریر کیا ہے ـــــ یہ ڈرامہ اتنا پُر لطف ہے کہ جو ساتھی اس کی ایک قسط پڑھ لیں گے، وہ اس کی تمام قسطیں پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

یہ ڈرامہ جناب نیّر مسعود کے شکریے کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

کام کرنے والے

ہارون رشید: اب سے گیارہ بارہ سو برس پہلے اسلامی دنیا کا بادشاہ

ابو الحسن: بغداد کا ایک نوجوان

جعفر برمکی: ہارون رشید کا وزیر اعظم

مسرور: خواجہ سراؤں کا افسر۔ اور دوسرے خواجہ سرا

کافور: خلیفہ کا حبشی غلام۔ اور دوسرے غلام

کوکب الصبح، سلک مروارید، مہ تاب وغیرہ، کنیزیں کوتوال، داروغہ اور دوسرے درباری امیر اور افسر ابو الحسن کی ماں تین پڑوسی۔

خلیفہ ہارون رشید کی عادت تھی کہ وہ رات کے وقت طرح طرح کے بھیس بدل کر اپنی رعایا کا حال جاننے کے لئے نکلا کرتا۔ ایک رات .....

(منظر) بغداد کا پُل

[ابو الحسن دجلہ کے پل پر بیٹھا ہوا ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔ خلیفہ ہارون رشید ایک غلام کے ساتھ سوداگر کے بھیس میں آتا ہے۔ ابو الحسن اسے آواز دیتا ہے]

ابو الحسن: بھلے آدمی! تمہارا لباس بتاتا ہے کہ تم بغداد کے رہنے والے کسی طرح نہیں ہو۔

خلیفہ: میاں تم نے خوب پہچانا! ہاں میں بغداد کا باشندہ نہیں، موصل کا سوداگر ہوں۔

ابو الحسن: بس تو بھائی موصل کے سوداگر! کیا آج رات میرے غریب خانے پر چلنے کی زحمت کرو گے؟ وہاں ہم دونوں مل کر کھانا کھائیں گے۔ عمدہ قسم کے شربت پیش گے۔ باتیں کریں گے، میں اپنی سناؤں گا تم اپنی سنانا۔

خلیفہ: بڑے شوق سے چلوں گا۔ بھلا اتنی محبت سے دی ہوئی دعوت کون ٹھکرا سکتا ہے؟

ابو الحسن: (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) آؤ چلو..... (رک کر) مگر ایک شرط ہے!

خلیفہ: شرط! وہ کیا؟

ابو الحسن: یہ کہ ہماری دوستی صرف آج تک رہے گی۔ کل سویرے آپ میرے گھر سے چلتے پھرتے نظر آیئے گا، اور پھر کبھی مجھ کو اپنا منہ نہ دکھایئے گا!

خلیفہ: (حیران ہو جاتا ہے) ایں!؟ یہ کیسی شرط؟ بھائی تم تو عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو! بھلا ایسی بھی بے مروتی.....

ابوالحسن: (ہاتھ اٹھا کر) مروت اور بے مروتی تو میں جانتا نہیں بس یہ شرط اس لئے ہے کہ زیادہ ساتھ رہنے اور بار بار ملنے سے کہیں تم میرے دوست نہ بن جاؤ! سمجھے اور میں دشمنوں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا دوستوں سے۔

خلیفہ: بھائی تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ آخر معاملہ کیا ہے؟

ابو الحسن: معاملہ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ لو سنو۔ (پل پر بیٹھ جاتا ہے اور خلیفہ اور غلام بھی بیٹھ جاتے ہیں)

خلیفہ: ہاں اب سناؤ۔

ابو الحسن: میرا نام ابوالحسن ہے۔ میں ایک بہت امیر سوداگر کا بیٹا ہوں۔ باپ کے مرنے کے بعد ساری دولت میرے ہاتھ آئی جسے میں نے دل کھول کر اڑایا! ہر وقت یاروں کا جمگھٹا لگا رہتا جو مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹتے تھے۔ شراب، کباب ناچ گانے اور سیر سپاٹے میں دن گزرتے تھے۔ بے حساب خرچ ہوتا تھا۔

روپیہ آخر کب تک چلتا؟

خلیفہ: بے شک اگر قارون کا خزانہ بھی اس طرح لٹایا جائے تو آخر ایک دن ختم ہو ہی جائے گا۔

ابوالحسن: ہے نا؟ اسی طرح ایک دن میری دولت بھی ختم ہو گئی۔ اب غریبی جو آئی تو دوستوں نے ایک ایک کر کے کھسکنا شروع کیا۔ آخر یہ نوبت پہنچی کہ کوئی دوست راستے میں ملتا بھی تو یوں منہ پھیر لیتا جیسے پہچانتا ہی نہیں!

خلیفہ: افسوس افسوس، اس وقت کیا گزرتی ہوگی تمہارے دل پر!

ابوالحسن: دنیا سے جی کھٹا ہو گیا میرا۔ ہر وقت منہ لپیٹے پڑا رہتا۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی سُدھ ایک دن میری ماں نے مجھ کو بہت اداس دیکھ کر کہا، "بیٹا! میں تو تیرے لچھن دیکھ کر پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ دن آنے والا ہے۔ اب تو تجھے معلوم ہوا کہ وہ سب مطلب کے

دوست تھے۔" میں یہ باتیں سن کر رونے لگا۔ اور ایک مرتبہ پھر اپنے دوستوں کے پاس جا کر، جن پر مجھے بڑا بھروسا تھا، کچھ روپیہ قرض مانگا۔ مگر سب نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

خلیفہ: مطلب کے دوست اس کے سوا اور کیا دے سکتے تھے؟

ابوالحسن: میں خالی ہاتھ ان کے دروازے پر گیا اور خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ اب میں نے قسم کھائی کہ آئندہ کسی سے دوستی نہیں بڑھاؤں گا اور بغداد کے رہنے والوں سے تو بات بھی نہ کروں گا۔

خلیفہ: بالکل ٹھیک کیا۔ پھر.....؟

ابوالحسن: پھر میں نے کچھ جائیداد بیچ کر روپیہ اکٹھا کیا۔ اس سے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا۔ اب جو پیسے ملتے ہیں، انہیں مزے مزے خرچ کرتا ہوں۔ روز کسی اجنبی مسافر کو گھر لے جاتا ہوں اس کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں، ہنستا بولتا ہوں اور سویرے تڑکے اسے رخصت کر دیتا ہوں۔ یہ اس لئے کہ دوستوں کی وجہ سے مل بیٹھ کر کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ بس یہ ہے میری کہانی۔

خلیفہ: دوست تم تو بڑے مزے کے آدمی ہو! چلو، مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔

ابوالحسن: بسم اللہ! آؤ چلیں۔

[تینوں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں]

(منظر) ابوالحسن کا مکان

(ابوالحسن اور خلیفہ کھانا کھا چکے ہیں۔ اب دونوں شربت پی رہے ہیں۔ شیشے کی خوبصورت صراحیوں میں رنگ برنگے شربت بھرے ہوئے ہیں۔ سنہری طشتریوں میں میوے رکھے ہوئے ہیں)

خلیفہ: واللہ ابوالحسن! میں نے دنیا جہان کے کھانے کھائے، قسم قسم کے شربت پیئے۔ مگر یہ مزہ کہیں نہ پایا جو تمہارے یہاں ملا۔ جی چاہتا ہے روز ہم تم اسی طرح مل بیٹھ کر کھایا پیا کریں۔

ابوالحسن: دل تو میرا بھی یہی چاہتا تھا، مگر کیا کروں، اپنی قسم سے مجبور ہوں۔ جیسا کہ تمہیں بتا چکا

ہوں۔

خلیفہ: ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میری خاطر اپنا طریقہ کیوں بدلو (جمائی لیتا ہے) اچھا پھر اب تم آرام کرو میں بھی سوتا ہوں۔ سویرے ہی یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمہارے اس احسان کے شکریے میں کچھ میں بھی تمہاری خدمت کروں۔ مجھے تم اپنے بغدادی دوستوں کا سا نہ پاؤ گے جنھوں نے تمہیں لوٹنے کے بعد پلٹ کر خبر تک نہ لی۔

ابو الحسن: تمہارا یہی احسان کیا کم ہے کہ تم نے میری دعوت قبول کی۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اب مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں۔ مزے میں زندگی کٹ رہی ہے..... (کچھ سوچ کر) ہاں البتہ میں ایک مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں۔ مگر تم پردیسی ہو اس میں کیا مدد کر سکتے ہو۔

خلیفہ: بتاؤ بتاؤ۔ شاید میں کسی کام آ سکوں۔

ابو الحسن: بھائی! اس محلے کی مسجد کا مُلّا بڑا ہی خبیث ہے! دوسروں کو تو پانچوں وقت اذان دے کر نماز کے لئے بلاتا ہے، اور خود رنگ رلیوں میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے چار لنگوٹیے یار بھی ہیں۔ یہ پانچوں مل کر محلے بھر کا ناک میں دم کئے ہوئے ہیں کسی کو پیٹ دیا، کسی کا مال اڑا لیا، کس کو جھوٹی سچی شکایتیں کر کے بند کروا دیا، اور میرے تو اس بری طرح پیچھے پڑے ہیں کہ خدا کی پناہ!

خلیفہ: توبہ توبہ، مُلّا اور یہ حرکتیں!

ابو الحسن: جی ہاں!

خلیفہ: (سوچتے ہوئے) مگر ان کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟

ابو الحسن: علاج؟ (غصے میں فرش پر ہاتھ مار کر) اگر خدا ایک دن کے لئے مجھے خلیفہ ہارون رشید کی جگہ دے دیتا تو میں تمہیں بتاتا کہ ان کا علاج کیا ہو سکتا ہے!

خلیفہ: بھلا وہ کیا؟

ابو الحسن: وہ یہ کہ چار سو کوڑے اس منحوس مُلّا کی پیٹھ پر اور سو سو کوڑے اس کے چاروں گُرگوں کی

پیٹھ پر گنوا دیتا اور پھر ان سے پوچھتا کہ اب تمہیں ..... معلوم ہوا کہ پڑوسیوں کو ستانے کی سزا کیا ہے؟

خلیفہ: (کچھ سوچ کر مسکراتا ہے) کون جانے خدا تمہیں سچ مچ ایک دن کے لئے خلیفہ بنا دے۔ یا خود خلیفہ ہارون رشید ہی تمہیں ایک دن کے لئے اپنی حکومت دے دے! اور کیا کروں، میں تو ایک اجنبی سوداگر ہوں، ورنہ اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد ضرور کرتا۔

ابو الحسن: تم میرا مذاق اڑاتے ہو! اور ٹھیک بھی ہے اگر خلیفہ سن لے تو وہ بھی میری خوب ہنسی اڑائے۔ بلکہ شاید گردن ہی اڑا دے۔

خلیفہ: (ابو الحسن کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے) کیا بات کرتے ہو دوست! بھلا تم نے میری اتنی خاطر کی جی بہلایا اور میں تمہارا مذاق اڑاؤں گا! نہ خلیفہ ایسا ناسمجھ ہے کہ ایسی بات پر ہنسی اڑائے۔ (انگڑائی لیتا ہے) اچھا اب آدھی رات ہونے آئی، اب سونا چاہئے۔

ابو الحسن: مگر یہ تھوڑا سا شربت بچ رہا ہے، اسے بھی ختم کر دو، اور سویرے یہاں سے چلتے وقت یاد کر کے باہر کا دروازہ بند کرتے جانا۔

خلیفہ: اچھا، مگر میرے ہاتھ سے ایک مرتبہ اور شربت تو پی لو۔

(شربت انڈیلتا ہے اور ابو الحسن کی نظر بچا کر اس میں بے ہوشی کی دوا ملا دیتا ہے۔ ابو الحسن کو دیتا ہے ابو الحسن شربت پیتے ہی اونگھنے لگتا ہے۔)

ابو الحسن: آج کی رات تمہاری وجہ سے بہت اچھی ..... (بے ہوش ہو جاتا ہے)

خلیفہ: (غلام کو آواز دیتا ہے) "کافور!! (غلام ہاتھ جوڑ کر قریب آ جاتا ہے) اس آدمی کو کندھے پر لاد کر میرے پیچھے آ۔ اور اس گھر کا راستہ اچھی طرح پہچان لے۔ اس کو یہیں واپس بھی لانا ہے۔"

(غلام ابو الحسن کو کندھے پر اٹھا لیتا ہے۔ دونوں باہر چلے جاتے ہیں)

(ابو الحسن پر کیا بیتی۔ یہ آئندہ شمارے میں پڑھئے)

جو تنہا سجاتے ہیں خوشیوں کے میلے

محمد جاوید خالد

دو افراد ایسے ملے اک جگہ پر
تھے چھوڑے جنہوں نے سفر کے لئے گھر
چلے اب وہ مل کر محبت جتاتے
وہ اک ساتھ رہتے، اکٹھے ہی کھاتے

نئی بات اک دن سفر میں ہوئی پھر
کہ چلتے چلے جا رہے تھے مسافر
مگن اپنی باتوں میں تھے خوش بہت وہ
نظر آئی تھیلی روپوں کی اک ان کو

انہیں میں سے اک نے لپک کر اٹھالی
اٹھاتے ہی دامن میں اپنے چھپالی
کہا دوسرے سے کہ "اے میرے بھائی
یہ تھیلی روپوں کی عجب میں نے پائی"
یہ سن کر کہا دوسرے نے "برادر
کہو ہم نے تھیلی کو پایا ہے مل کر"

کہا پھر یہ پہلے نے "لپکا تھا میں ہی
شریک اس میں کیوں ہو کوئی دوسرا بھی"

غرض یونہی لڑتے جھگڑتے چلے اب
محبت تھی پہلے بگڑتے چلے اب

کچھ آہٹ انہوں نے اچانک ہی پائی
سُنا غور سے تو یہ آواز آئی

کہ پیچھے کئی لوگ باتوں میں باہم
کبھی لہجہ اونچا کبھی شور کچھ کم

انہی کی طرف آ رہے تھے وہ سارے
تھیں باتیں بھی ان کی انہی پر اشارے

یہ آواز آئی "وہ جاتے ہیں آگے
جو تھیلی روپوں کی چرا کر ہیں بھاگے"

یہ سن کر جو تھیلی کا تھا پانے والا
اکیلے ہی حق اس پر جتلانے والا

لگا اپنے ساتھی سے کہنے کہ "ہمدم
ہوا یہ بُرا ہائے مارے گئے ہم"

کہا دوسرے نے کہا کہ "کہتے ہو "ہم" کیوں؟
کہو اب کہ ہائے "میں" مارا گیا ہوں

میں تھیلی کے پانے میں کب تھا گوارا
پھر آفت میں ساتھی بنوں کیوں تمہارا؟"

جو چاہو کہ ہمدردیاں پاؤ دُکھ میں
تو اوروں کو شامل کرو اپنے سکھ میں

جو تنہا سجاتے ہیں خوشیوں کے میلے
وہ رہتے ہیں وقتِ مصیبت اکیلے

سوال یہ ہے

ایاز محمود

سائنسی معلومات کا کالم

سوال:۔ کھڑے پانی میں بدبو کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟

عبدالمجید انجم عثمانی، جھنگ صدر۔

جواب:۔ چھوٹے تالابوں اور جوہڑوں میں کھڑے پانی میں بدبو نامیاتی اجسام کے گلنے سڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ پانی میں موجود خردنامئے، کیڑے مکوڑے، پودے اور پتے وغیرہ گلنے اور سڑنے کے عمل سے گزرتے ہیں۔ نتیجتاً ایک کیمیاوی عمل کے ذریعے بدبو پیدا ہوتی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء مثلاً گوشت، اناج اور سبزی وغیرہ اگر رکھے رکھے سڑ جائیں تو ان میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔

کھڑا ہوا پانی ہو یا کھانے پینے کی چیزیں، ان میں بدبو کا عمل اللہ تعالیٰ کی مصلحت سے خالی نہیں۔ بدبو دراصل ایک اشارہ ہے کہ یہ پانی گندہ اور صحت کے لئے مضر ہے اور کھانے کی چیز سڑ کر استعمال کے قابل نہیں رہی ہے۔

سوال:۔ گندہ انڈا پانی میں کیوں ڈوب جاتا ہے جب کہ صحت بخش انڈا تیرتا رہتا ہے۔

ذیشان اظہر، رحیم یار خان۔

جواب:۔ یہ سوال کرنے سے پہلے اگر آپ "صحت بخش" انڈے کو پانی میں تیرانے کی کوشش کرتے تو یہ دیکھتے کہ یہ پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ پھر آپ کا سوال یوں ہوتا کہ گندہ انڈا پانی میں کیوں تیرتا ہے جب کہ صحت بخش.....؟

بھائی بات یہ ہے کہ گندے انڈے میں موجود مائع جات ایک کیمیاوی عمل کے تحت گیس میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں انڈا پانی سے ہلکا ہو کر پانی کی سطح پر تیرتا ہے۔ یہی اس کی پہچان ہے اور یوں توڑے بغیر گندے اور درست انڈے کا فرق معلوم کیا جا سکتا ہے۔

سوال:۔ جب ہم سو کر اٹھتے ہیں تو ہمارا ذہن پر سکون کیوں ہوتا ہے؟

نوید اختر، کراچی۔

جواب:۔ نیند انسان کی بنیادی ضرورتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کی ضرورت ہمیں اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ہمارا ذہن اور جسم آرام کرنا چاہتے ہیں۔ اور یوں وقتی طور پر ان کو ان کاموں سے نجات مل جاتی ہے جو جاگنے کی حالت میں سر انجام دینے پڑتے ہیں۔ اگر ہم کوشش کر کے مستقل جاگنے کی کوشش کریں تو ہم ذہنی اور جسمانی، دونوں اعتبار سے جلد ہی تھک جائیں گے اور ممکن ہے کہ بیمار ہی پڑ جائیں۔ سائنس دانوں نے پتا لگایا ہے کہ نیند کی حالت میں ہمارے ذہن کی برقی سرگرمی سست پڑ جاتی ہے جسے آلات کی مدد سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ہم کیوں سوتے ہیں۔۔۔؟ یہ وہ سوال ہے جس کا حتمی جواب ابھی تک معلوم نہیں۔ اس بارے میں سائنس دانوں کو مختلف آرا ہیں ایک رائے کے مطابق ہمارے جسم میں ایک ایسا مادہ ہے جو ہمیں جاگتے رہنے کے قابل بناتا ہے۔ جب اس مادے کی کمی ہونے لگتی ہے، ہمیں نیند کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور یہ مادہ نیند کی حالت میں دوبارہ بن جاتا ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نیند کی حالت میں گندے اور فاسد مادے جسمانی نظام سے نکل جاتے ہیں۔

یہ بہر حال طے شدہ بات ہے کہ ہم نیند کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں چھ سے آٹھ گھنٹے سونا صحت کے لئے ضروری ہے۔ چھوٹے بچوں کو اس سے زیادہ نیند کی ضرورت ہوتی ہے اور بالکل ننھے منے تو زیادہ تر وقت سوتے ہی پائے جاتے ہیں۔

نیند ہمارے جسم، دماغ اور اعصاب کے لئے آبِ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ نیند کی حالت میں ذہن کو سکون ملتا ہے اور جسم کے ان خلیات کی مرمت کا کام ہوتا ہے جو دن بھر ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رات کو تھک ہار کر سونے کے بعد جب ہم صبح اٹھتے ہیں تو ہشاش بشاش اور تر و تازہ ہوتے ہیں اور آنے والے دن کے استقبال کے لئے تیار۔

بچوں کے عالمی دن کے موقع پر یونیسف اور پاکستان ینگ رائٹرز فورم صوبہ سرحد کے تعاون سے منعقد کی گئی تقریب کی تصویری جھلکیاں

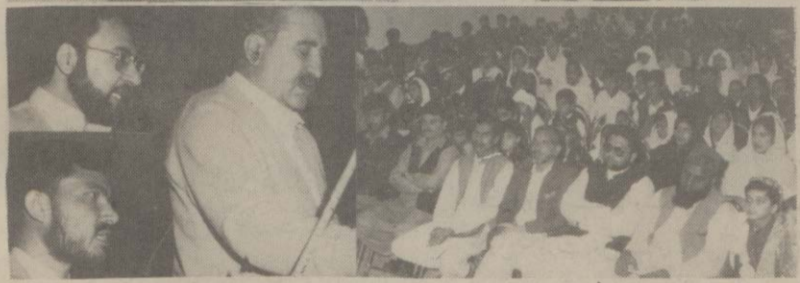

مہمان خصوصی صوبائی وزیر ثقافت ڈاکٹر محبوب الرحمٰن، معروف دانشور ڈاکٹر محمد فاروق خان اور فورم کے صوبائی صدر احسان الحق حقانی خطاب کر رہے ہیں۔

مہمان خصوصی جیتنے والوں میں انعامات تقسیم کرتے ہوئے۔

سچ بولنے والا جوڑ

محمد شہزاد خان کستوری

عنبرین ایک چھوٹی بچی تھی لیکن زیادہ چھوٹی بھی نہیں وہ بہت بہادر تھی۔ اور ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اس لئے خاصی سمجھدار تھی۔ اس کی ایک سہیلی تھی جس کا نام سارہ تھا۔ وہ اس کی گہری دوست تھی۔ لیکن بہت ہی ڈرپوک تھی۔

ایک روز جب کہ اچانک کسی وجہ سے اسکول کی چھٹی ہو گئی تھی تو عنبرین سارہ کے ساتھ گھر کے قریب واقع جھیل پر چلی گئی یہ جھیل ایک پھول کی شکل کی تھی اور اس کے آس پاس کا ہرا بھرا ماحول آنکھوں کو بھلا لگتا تھا۔

تعطیل والے دن لوگ دور دور سے جھیل کی سیر کو آتے اور یہاں رش رہتا لیکن عام دنوں میں جھیل خالی نظر آتی تھی۔

"عنبرین ادھر آؤ دیکھو تو یہاں کتنی ساری مچھلیاں تیر رہی ہیں۔" سارہ نے جھیل کے ہرے ہرے پانی میں جھانکتے ہوئے کہا۔ سارہ کی آواز سن کر عنبرین نے لکڑی کی بینچ پر بیٹھے بیٹھے گردن گھمائی پھر کاہلی سے کہا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" اس کے لہجے میں بیزاری کا عنصر نمایاں تھا۔ اس وقت وہ اکیلی بینچ پر بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا اور صبح کی دھوپ کا لطف اٹھانا اس کے لئے بہت مزے دار کام تھا۔

تالاب کے ہرے ہرے پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور ٹیڈپول تیر رہے تھے۔ سارہ نے جب دیکھا کہ عنبرین نہیں آرہی تو جھٹ جوتے اتار کر اپنے پاؤں پانی میں چھپ چھپ کرنے لگی۔ ابھی اسے یہ کام کرتے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس کی نظر ذرا دور درختوں کے درمیان سرخ رنگ کے مخروطی خیمے پر پڑی۔ "عنبرین وہ دیکھو..... کسی کا گھر۔" وہ چلائی۔ عنبرین نے اس کی آواز پر حیرانی سے دیکھا واقعی ذرا دور درختوں کے درمیان سرخ رنگ کا خیمہ نظر آرہا تھا۔

"میرا خیال ہے یہاں کوئی رہتا ہے۔ چلو دیکھتے ہیں۔" "نہیں نہیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" سارہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

خیمے کے گول دروازے پر سرخ رنگ کا پردہ پڑا تھا۔ عنبرین بے دھڑک خیمے تک چلی گئی پھر اس نے پردے سے جھانکنے کی کوشش کی مگر پردہ موٹا تھا۔ چنانچہ وہ پردہ ہٹا کر خیمے کے اندر چلی گئی۔ جبکہ سارہ کچھ دور کھڑے ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اسے عنبرین کا سر نظر آیا۔

"سارہ آجاؤ یہاں کوئی بھی نہیں۔" عنبرین کی آواز سن کر سارہ بھی خیمے میں داخل ہو گئی۔

خیمہ کا ماحول اندر سے عجیب و غریب تھا۔ ایک طرف کونے میں ہنڈیا تھی جس میں پیلے رنگ کا گاڑھا مادہ ابل رہا تھا۔ جبکہ نیچے آگ نہیں تھی۔ دیواروں پر عجیب و غریب تصویریں اور نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک میز پر شیشے کی بڑی سی گیند رکھی تھی جس میں رنگ برنگے عکس جھلملا رہے تھے۔ "مجھے تو یہ کسی جادوگر کا کمرہ لگتا ہے۔" عنبرین نے حیرت سے کہا۔ "جادوگر.....!" سارہ تو بالکل ہی ڈر گئی۔ اچانک پیچھے سے کسی کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

دونوں لڑکیوں کی ڈر کے مارے چیخ نکل گئی۔ عنبرین کرسی سے گر پڑی اسی وقت ایک مرغی پھڑپھڑاتی ہوئی کرسی کے نیچے سے نکلی اور عنبرین ٹوٹی ہوئی کرسی میں غائب ہو گئی۔ سارہ نے زور سے دوسری چیخ ماری کیوں کہ اس کے سامنے عجیب و غریب شکل کا آدمی کھڑا تھا۔ جس کی آنکھیں نیلی تھیں اور چہرے پر مختلف رنگوں سے نقش و نگار بنے تھے۔ وہ سر پر لمبوتری سی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا جس پر چاند تارہ بنا تھا۔ "تت..... تم کون ہو.....؟" سارہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "پہلے تم بتاؤ تم کون ہو اور میرے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟" اس نے الٹا سوال کر دیا۔

"مم..... میں سارہ ہوں۔" سارہ نے ہکلا کر کہا۔ وہ آدمی مسکرایا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ڈرو نہیں میں گاجر جادوگر ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ ذرا جھکا اور سر سے ٹوپی اتاری تو ٹوپی میں سے ایک زندہ خرگوش چھلانگ مارتا ہوا نکلا اور خیمے کے باہر غائب ہو گیا۔ سارہ حیران رہ گئی۔ جادوگر نے اپنے ہاتھ سے گاجروں سے بھری ٹوکری میز پر رکھ دی اور ایک گاجر اٹھا کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ سارہ نے پریشانی کے عالم میں خیمے میں ادھر ادھر دیکھا۔ عنبرین نظر نہیں آ رہی تھی۔ کرسی کے قریب موٹی سی ایک مرغی کوں کوں کر رہی تھی۔ "کیا آپ نے میری سہیلی کو جادو کے زور سے مرغی بنا دیا ہے؟" سارہ کے منہ سے یہ سن کر جادوگر نے زور دار قہقہہ لگایا جس سے خیمے کے اندر لگی چیزیں ہلنے لگی اور سارہ خوف سے کانپنے لگی۔

"ڈرو نہیں لڑکی۔" جادوگر نے قہقہہ روک کر کہا۔

"تمہاری سہیلی یہ مرغی نہیں وہ تو ٹوٹی ہوئی کرسی کے نیچے بے ہوش پڑی ہے۔ شاید نیچے گرنے سے اس کے سر پر چوٹ لگ گئی ہے۔ لیکن فکر نہیں کرو میں ابھی اس کی چوٹ ٹھیک کر دیتا ہوں اور ابھی تمہاری سہیلی ہوش میں آ جائے گی۔" یہ کہہ کر جادوگر نے پہلے تو بے ہوش عنبرین کو ٹوٹی ہوئی کرسی کے نیچے سے نکالا پھر منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھ کر ہوا میں پھونک ماری تو عنبرین کے سر پر زخم کا نشان غائب ہو گیا اور وہ آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھی۔ "ہیں ..... یہ لمبوتری ٹوپی والا کون ہے؟" عنبرین نے حیرانی سے گاجر جادوگر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ گاجر جادوگر ہیں۔" سارہ نے بتایا۔ "گاجر جادوگر؟" یہ کیا نام ہوا بھلا.....؟" عنبرین نے جیسے خود ہی سے کہا پھر جادوگر سے بولی۔ "یہ تمہارا نام گاجر کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ میں گاجریں شوق سے کھاتا ہوں اور بہت کھاتا ہوں اس لئے لوگوں نے میرا نام گاجر جادوگر رکھ دیا ہے۔"

"جادوگر نے مزے مزے سے گاجریں کھاتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے وہ لوگ بھی اچھے لگتے ہیں جو گاجر کھاتے ہیں۔ اسی لئے خرگوش میرا دوست ہے کیونکہ وہ بھی بہت شوق سے گاجریں کھاتا ہے۔ لو تم بھی کھاؤ۔" جادوگر نے ایک گاجر عنبرین کو دی جس کو دیکھ کر عنبرین کا منہ بن گیا۔ اسے پھل فروٹ سے زیادہ کھٹی میٹھی گولیاں اور بسکٹ اچھے لگتے تھے لیکن اس نے جادوگر کا دل رکھنے کے لئے گاجر اس کے ہاتھ سے لے لی۔ "یہ لو تم بھی کھاؤ۔" جادوگر نے ایک صاف ستھری سرخ سی گاجر سارہ کے ہاتھ میں بھی تھما دی اور سارہ بھی گاجر کھانے لگی۔

گاجر چباتے ہوئے عنبرین نے بڑے اشتیاق سے شیشے کی گیند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

یہ میری جادوئی گیند ہے۔ اس میں سب نظر آتا ہے۔"

"سچ تو کیا ابو بھی....." عنبرین نے خوشی سے

تالی بجائی۔ "تمہارے ابو ..... وہ کہاں ہیں؟" جادوگر نے پوچھا۔

"وہ باہر ہیں دوبئی میں۔" عنبرین نے فوراً کہا۔

"خیر میں کوشش کرتا ہوں۔" جادوگر نے تھوڑی دیر تک کچھ پڑھ کر گیند پر پھونک ماری۔ فوراً ہی اس میں عنبرین کے ابو دکھائی دینے لگے۔ وہ ایک کارخانے میں سخت محنت کا کام کر رہے تھے۔

"ابو!" عنبرین خوشی سے اچھل پڑی۔ مگر ابو تک اس کی آواز نہیں جا سکتی تھی۔ عنبرین کو بہت دکھ ہوا کہ اس کے ابو اس کے لئے وہاں کتنی محنت سے کام کر رہے ہیں جادوگر نے عنبرین اور سارہ کو کئی کمالات دکھائے۔ جنہیں دیکھ کر دونوں بچیاں بہت خوش ہوئیں۔

جب کافی سارا وقت باتوں اور جادوگر کے کمالات دیکھنے میں بہہ گیا تو سارہ نے اس طرف توجہ دلائی۔ "افوہ! شام کے پانچ بج گئے ہیں ..... کیا گھر نہیں چلنا ہے ..... گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" عنبرین نے ہاتھ پہ بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر کہا۔

"ہاں بھئی ٹائم تو بہت ہو گیا ہے۔" جب دونوں سہیلیاں اپنے گھروں کو جانے لگیں تو جادوگر نے کہا۔ "جانے سے پہلے میں تمہیں ایک تحفہ دوں گا جو دنیا میں کسی کے پاس نہیں۔"

"اچھا!!..." "کیا ہے وہ تحفہ؟" دونوں سہیلیاں تحفہ دیکھنے کے لئے بے چین ہو گئیں۔ جادوگر نے کالے رنگ کے چمکیلے جوتوں کی ایک جوڑی عنبرین کو پکڑا دی۔ "یہ کیا ہے؟" عنبرین نے حیرانی سے کہا۔

"یہ جوتے ہیں۔" جادوگر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایسے جوتے تو ہمارے پاس بھی ہیں۔" اس بار سارہ بولی۔ "یہ وہ جوتے نہیں ..... یہ سچ بولنے والے جوتے ہیں۔" جادوگر نے کہا۔

"کیا یہ جوتے بولتے ہیں؟" عنبرین نے حیران ہو کر کہا۔ "ہاں یہ بولتے ہیں اور صرف سچ بولتے ہیں۔" جادوگر نے بتایا۔ "یہ اس وقت بولتے ہیں جب ان سے کچھ پوچھا جائے۔"

"ٹھیک ہے میں ابھی آزما لیتی ہوں"۔ عنبرین بولی پھر اس نے جوتوں سے پوچھا۔

"ذرا میرا نام تو بتانا۔" عنبرین کا سوال سن کر جوتے بول پڑے۔ "آپ کا نام عنبرین ہے۔" یہ آواز بہت باریک مگر بہت واضح تھی۔

"واہ اب مزا آئے گا۔"

عنبرین نے جوتے اٹھائے اور جادوگر کا شکریہ ادا کر کے دونوں سہیلیاں خیمے سے باہر نکل آگئیں۔

دوسرے دن عنبرین اسکول جادوگر کے دیئے ہوئے جوتے پہن کر گئی۔ وہ اپنی سہیلیوں کو یہ حیرت انگیز جوتے دکھانا ہی چاہتی تھی ابھی وہ گیلری میں پہنچی تھی کہ پیچھے سے زور دار دھکا لگا اور وہ گر پڑی۔ اس کا گھٹنا چھل گیا اور خون رسنے لگا۔

"کون تھا یہ؟" عنبرین نے پیچھے مڑ کر

دیکھا۔ تو بہت سی لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ "ٹھہرو میں خود ہی معلوم کر لیتی ہوں۔" دھکا کس نے دیا ہے؟" عنبرین نے جوتوں سے سوال کیا تو جوتوں نے کہا۔ "دھکا معوش نے دیا ہے۔"

"جوتوں میں سے باریک سی آواز سن کر سب لڑکیاں حیران رہ گئیں عنبرین غراتی ہوئی معوش کی طرف بدلہ لینے بڑھ ہی رہی تھی کہ مس نگت ہاتھ میں چھڑی لئے آ گئیں۔ "آپ لوگ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔ چلئے کلاس میں۔" عنبرین خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

جماعت میں تمام لڑکیاں بار بار عنبرین کو دیکھ رہی تھیں۔ کیونکہ انہیں جوتوں کی حیرت انگیز صلاحیت کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ "اوں اوں ....." ایک بچی روتے ہوئے مس کے پاس آئی۔ "کیا ہوا آپ کو؟"

مس نے نرمی سے پوچھا۔ "میری امی نے مجھے سیب دیئے تھے اور کہا تھا ہاف ٹائم میں کھا لینا۔" "ہاں تو آپ کھا لیجئے گا۔"

مس بولیں۔ "مگر وہ اب بستے میں نہیں ہیں بچی نے بدستور روتے ہوئے کہا۔" ہائے ..... اف" ایک اور لڑکی بھی مس کے پاس آئی جو بری طرح چیخ رہی تھی۔ "ارے آپ کو کیا ہوا؟" مس اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"اف ..... مس ہائے مر گئی ..... کسی نے ..... میری کمر پر ..... اف کھجلی لگا دی ہے۔"

"کھجلی؟" مس الجھن میں پڑ گئیں۔ جماعت کی مانیٹر نے انہیں بتایا۔

" ایک خاص قسم کے کیڑے اکثر جنگلی گھاس سے چمٹے رہتے ہیں اور کپڑوں سے چمٹ کر بہت تکلیف دیتے ہیں۔ انہیں کھجلی کہتے ہیں۔"

"کون ہے یہ بد تمیز؟" مس چھڑی ہاتھ میں لے کر گرجیں مس یہ حرکت عنبرین نے کی ہے۔" ایک چھوٹی لڑکی نے سیٹ سے کھڑے ہو کر بتایا مگر عنبرین نے صاف انکار کر دیا حالانکہ یہ شرارت اسی کی تھی۔ مس چھڑی لے کر اس کے قریب آئیں تو وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور مس سے بولی۔ "مس یہ شرارت میں نے نہیں کی ہے۔" پھر بے خیالی میں ایک دم سے کہا۔ "مس یقین نہ آئے تو میرے جوتوں سے پوچھ لیجئے۔"

"جوتوں سے؟"

مس نے حیرانی سے کہا۔ "ہاں مس عنبرین کے پاس سچ بولنے والے جوتے ہیں۔"

جماعت کے بچوں نے بتایا۔ مس کو پہلے تو یقین نہ آیا پھر جب انہوں نے جوتوں سے پوچھا تو وہ پٹ پٹ بولنے لگے۔ "مس معوش کے کھجلی عنبرین نے لگائی تھی اور اسی نے انعم کا سیب بھی چرا کر کھایا ہے۔" جوتے سچ بول رہے تھے اور عنبرین کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔

جوتوں کی سچی گواہی کے بعد پہلی بار جماعت میں عنبرین کی مار بھی لگی اور اسے مرغا بھی بننا پڑا۔ پھر

چھٹی کے بعد بچوں نے اتنا چڑایا کہ عنبرین کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ فوراً خیمے والے جادوگر کے پاس گئی۔ "ارے ہماری ننھی دوست آؤ آؤ۔" جادوگر اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔

"میں آپ کے یہ جوتے واپس کرنے آئی ہوں۔ یہ گندے ہیں اور میری برائیاں کرتے ہیں۔"

"ہاہاہا..... " جادوگر نے یہ سنا تو ایک قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے اس لئے جھوٹوں کو پسند نہیں آتا۔" یہ کہتے ہوئے جادوگر نے عنبرین کے ہاتھ سے جوتے واپس لے لئے۔

جادوگر کا یہ جملہ سن کر عنبرین بہت شرمندہ ہوئی اور واپس آ گئی لیکن اس دن کے بعد اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

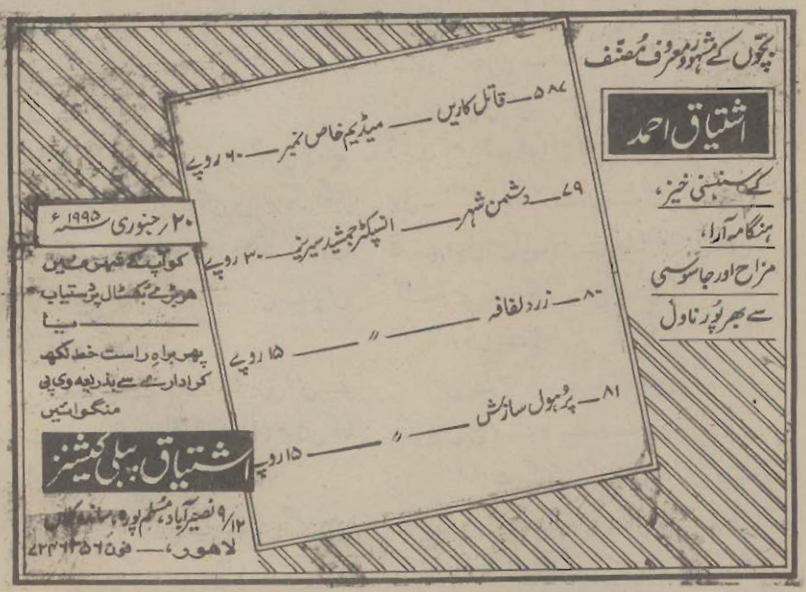

اِسے پلّو سے باندھ لیجئے

اپنی تحریر بھجواتے ہوئے یا ہمیں خط لکھتے ہوئے اپنا پتہ لفافے کی پشت پر لکھنے کو کافی نہ سمجھئے۔ اپنے ہر خط اور اپنی ہر تحریر کے پیچھے اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

ادارہ آنکھ مچولی

جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے

چیخ کی آواز سُن کر لوگ چونکے۔ تفریحی پارک میں بکھرے بچوں اور بڑوں کے قہقہے یک دم رک گئے۔ سب کے سر آسمان کی طرف اُٹھے، منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ عجیب منظر تھا۔ معصوم سی ایک بچی زمین سے سو فٹ اوپر موجود جھولے سے بس گرنے ہی والی تھی..... اس کا پورا جسم جھولے سے باہر لٹک رہا تھا بس سر تھا جو جھولے کی کھڑکی میں ذرا سا اٹکا ہوا تھا... وہ کسی بھی لمحے پھسل کر... فٹ نیچے زمین پر گر سکتی تھی.... پانچ سال کی معصوم بچی.... سو فٹ کی عظیم بلندی.... انجام صاف ظاہر تھا... مگر کہتے ہیں ناں کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ پانچ منٹ تک سر کے معمولی سہارے سے یہ بچی لٹکی رہی۔ اس اثنا میں پارک کی انتظامیہ کے لوگ لمبی سی سیڑھی لے کر پہنچ گئے۔ بچی کو بحفاظت نیچے اتار لیا گیا۔ لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ بچی بہت خوف زدہ تھی مگر معجزانہ طور پر اسے کوئی بڑی چوٹ نہیں آئی تھی۔ بچی کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا تاکہ علاج ہو سکے۔ یہ بچی ٹی جی۔ یُون تھی اور یہ واقعہ جنوبی کوریا میں سیئول کے نزدیک ایک تفریحی پارک میں پیش آیا۔

ریحانہ منیر

چھوٹی سی جنت

شبانہ عرشی

"بجلی چلی گئی۔" کی آواز سنتے ہی تکیے بغل میں دبائے اور رکاوٹوں کو پھلانگتے ہوئے جب ہم لوگ چھت پر پہنچے تو منی کو پہلے ہی سے ٹنکی پر خرخر کرتے پایا۔ اس کے ساتھ ہی ہم لوگوں کے منہ لٹک گئے اور سب نیچے فرش پر ادھر ادھر آڑے ترچھے پھیل گئے۔

دراصل ہمارے گھر کی چھت خالی ہے۔ صرف اس کے بیچوں بیچ ٹنکی بنی ہوئی ہے جو رات کو کافی ٹھنڈی رہتی ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں جب بجلی چلی جاتی ہے۔ تو ہم میں سے ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ اس پر قبضہ جمالیں۔ لیکن منی ہمیشہ سب پر بازی لے جاتی تھی۔ اللہ جانے وہ اتنی بہادر کیسے ہے کہ بجلی جاتے ہی سب سے پہلے اٹھ کر تکیے سمیت اکیلے ہی چھت پر پہنچ جاتی ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ جب مچھر بھنبھوڑتے ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ بجلی چلی گئی ہے پھر ڈرتے ڈرتے

آنکھیں کھولتے ہیں اور چادر سے ایک انگلی نکال کر برابر میں سوئے ہوئے فہیم کو چھوتے ہیں پھر دوسری طرف علی کو، پھر تینوں ایک دوسرے کے سہارے باجی کے کمرے میں جاتے ہیں انہیں ہلا ہلا کر اٹھاتے ہیں وہ ہڑبڑا کر اٹھتی ہیں اور سب سے پہلے کہتی ہیں۔ "میز پر سے میرا چشمہ تو دینا۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ چشمہ لگا کر کچھ دیکھنے کے قابل ہوں ہم تینوں بھائی ہمت کر کے اپنے اپنے تکیے لے کر چھت پر پہنچ جاتے ہیں لیکن وہاں منی صاحبہ کو ٹنکی پر قبضہ جمائے دیکھ کر بغلیں جھانکنے لگتے ہیں ہم تینوں اکثر سوچتے ہیں کہ منی کو ڈر کیوں نہیں لگتا؟ فہیم کا کہنا ہے کہ "ابھی چھوٹی ہے ناں اس لئے گلے کٹوں اور پچھل پیریوں کا مطلب نہیں سمجھتی۔ ذرا بڑی ہو جائے تو پھر دیکھنا لال بیگ سے بھی دم نکلے گا اس کا۔" لیکن لگتا ہے وہ باجی پر گئی ہے کیوں کہ باجی جو کہ ڈاکٹری پڑھ رہی ہیں ہمارے خاندان میں سب سے زیادہ "بہادر" مشہور ہیں۔

ہم نے باجی کو اسفنج کی چپل پر مینڈک کو پنوں کی مدد سے پنچ کر کاٹتے دیکھا ہے مینڈک کو کاٹنے کے دوران وہ ناک پر پھسلنے والے چشمے کو درست کرتی ہیں تو کبھی مینڈک کی بے ہنگم پھیلی ٹانگوں کو جو پنوں سے باہر نکل آتی ہیں۔

باجی اپنے تجربوں کے لئے اکثر مینڈکوں کی تو کبھی جھینگوں کی اور کبھی لال بیگوں کی فرمائشیں کرتی رہتی ہیں۔ ایک مرتبہ بولیں۔ "مجھے ایک مینڈک کی اور ضرورت ہے۔ میڈم نے ایک ہی مینڈک دیا تھا۔" ہم نے کہا "تو کیا ایک سے آپ کا پیٹ نہیں بھرا" انہوں نے ہماری بات نظر انداز کر دی مینڈک تو ہمیں ہی لا کر دینا تھا انہیں۔ خیر ہم نے ایک مینڈک انہیں نالے کے کنارے سے بڑی مشکل سے پکڑ کر لا کر دیا۔ جھینگے تو بازار سے مل جاتے ہیں لیکن تل چٹہ (لال بیگ) ان دونوں جگہوں پر نہیں پائے جاتے اس کی تلاش باجی شرلاک ہومز کی طرح خود کرتی ہیں وہ اکثر اسٹور روم میں تو کبھی باورچی خانے کے کونے کھدروں میں گھسی دکھائی دیتی ہیں ان کے دماغ میں بس یہی بات سمائی رہتی ہے کہ کہیں سے لال بیگ ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کا پوسٹ مارٹم کریں۔ کل جب ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے تو باجی کے منہ سے اچانک بے خیالی میں نکل گیا۔ "میں تل چٹہ کھانا چاہتی ہوں۔" پھر بولیں۔ "اوہ نہیں سوری کچھ نہیں۔" باجی تو سوری کہہ کر خاموش ہو گئیں لیکن ہمیں اس وقت ایسا لگا کہ منہ میں کھانے کا نوالہ نہیں بلکہ (لال بیگ) آ گیا ہے جسے ہم کچڑ کچڑ چبا رہے ہوں۔ منی کو موقع ملا تو وہ بھی شروع ہو گئی کہ "میں بھی تل چٹہ کھاؤں گی۔ وہ سمجھتی تھی کہ تل جو کہ ریوڑیوں پر لگا ہوتا ہے اور چٹا یعنی گورا چٹا کا چٹا تو تل چٹا یعنی سفید تل۔ یاد رہے کہ منی تل والی ریوڑیاں بڑے شوق سے کھاتی ہے۔

"منی میرا خیال ہے تمہیں اب خاموش ہو جانا چاہئے۔" ہم نے درمیان میں دانت پیستے ہوئے کہا۔ "ہی ہی ہی....." منی نے دانت نکالتے ہوئے آواز نکالی۔ دل چاہ رہا تھا کہ پلیٹ مار کر منی کا ناریل توڑ دیں یا پھر بال نوچ لیں۔ لیکن اس طرح گنجہ ہونے کا خطرہ تھا اس قسم کی باتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب ابا جان ہمارے ساتھ کھانے کی میز (مطلب کرسی) پر بیٹھے ہوتے ہیں تو اس وقت ایسا لگتا ہے کہ کسی کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔ یا سب نے گونگوں.... کا گڑ کھالیا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے ہماری امی ایسے موقعوں پر کہاں ہوتی ہیں تو آپ کو یہ سن کر افسوس ہو گا کہ وہ اب ہمارے ساتھ نہیں وہ آسمان کی جنت میں ہیں اور ہم ان کی بنائی ہوئی جنت میں۔ ہم لوگ کل پانچ بہن بھائی ہیں سب سے بڑی باجی ہیں پھر ہم یعنی دانش۔ باجی ہم سے زیادہ بڑی نہیں ہیں بس یہی کوئی ایک ہاتھ بڑی ہوں گی۔ میرے بعد فہیم، فہیم کے بعد علی اور آخر میں منی۔ کوئی دس برس کی ہوگی لیکن باتیں اس کی بڑی بوڑھیوں جیسی ہیں جب پٹر پٹر باتیں کرتی ہے تو ہم سب کی نانی لگتی ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں گزر رہی تھیں سہ پہر کا وقت تھا ہم کمرے میں اکیلے بیٹھے کہانی کی کتاب پڑھ رہے تھے کہ اچانک کانوں میں آواز آئی کہ "آیئے کھایئے، چھولے شاہی چھولے۔" چھولے کی کھٹائی کے تصور سے ہمارے منہ میں کھٹا کھٹا پانی آ گیا جسے ہم نے کھٹ سے نگل لیا اور معاملے کو کھٹائی میں جانے سے بچانے کے لئے کسی بندر کی طرح چھلانگیں لگاتے ہوئے کھانے کی میز تک پہنچ گئے پھر اس کے درمیان میں رکھا ہوا گلدان ہٹایا لیکن گلدان ہٹاتے ہی ہمیں چکر سے آنے لگے در و دیوار لرزنے لگے۔ چھولے کھانے کا خواب چکنا چور ہوتا نظر آیا۔ کیونکہ ہمارے چھپائے ہوئے آٹھ آنے وہاں سے غائب تھے یقیناً کسی نے چوری کر لئے تھے۔ مرے مرے قدموں سے کمرے میں واپس آئے "آیئے کھایئے شاہی چھولے۔" کی آواز اب تیز ہو گئی تھی۔ چھولے والا دروازے پر کھڑا شاید ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ لیکن ہماری تو دنیا لٹ چکی تھی۔ "کتنے دنوں بعد تو شاہی چھولے والا آیا ہے۔" یہ سوچ کر ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے چھولے والے کی آواز سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہم نے پھٹے ہوئے گدے سے کھینچ کر روئی نکالی اور کانوں میں ٹھونس لی۔ لیکن شاید چھولے والا تو دماغ میں گھس گیا تھا اور ہتھوڑے کی طرح "شاہی چھولے شاہی چھولے" کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔ ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اور مایوسی کی حالت میں زمین پر آلتی پالتی مار کر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ یہ شدید مایوسی کی آخری حد تھی۔ ابھی کچھ دیر ہوئی تھی کہ ہمیں سانس لینے میں تکلیف محسوس ہوئی ہم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں دیکھا تو ارد گرد سارے بھائی بہن کھڑے ہیں

سب کے منہ ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے لیکن ہمیں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ ہم نے فوراً کانوں پر سے ہاتھ کو ہٹایا لیکن بے سود اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہم نے شور مچا دیا۔ "ہم بہرے ہوگئے ہم بہرے ہوگئے۔" ہمارا اتنا کہنا تھا کے سارے بہن بھائی دروازے سے باہر چلے گئے۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو انکے پیچھے پیچھے ابا جان تھے وہ آتے ہی ہمارے گرد دائرے کی شکل میں گھومنے لگے۔ ہم حیران کہ ابا جان کو کیا ہو گیا ہے۔ تین چکر کاٹنے کے بعد انہوں نے ہمارے کانوں سے روئی نکالی اور ہمارے ہاتھ پھیلا کر اس پر دھر دی۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے کانوں میں آواز کی چہل پہل شروع ہو گئی اور باجی کی سڑسڑ کرنے کی آواز سب سے پہلے کانوں میں آئی وہ بے چاری گھبرا کر رونے لگی تھیں۔ منی بولی۔ "بھائی جان ہم لوگ تو سمجھے کہ آپ اکیلے ہی اکیلے مراقبہ کر رہے ہیں۔"

علی بولا۔ "بھائی جان آپ دس کلو بادام خرید کر کھائیں حافظہ تیز ہو جائے گا۔" ابا جان اپنے کمرے میں واپس چلے گئے تھے ہم نے گلا تر کرنے کی خاطر منی سے پانی مانگا تو وہ بولیں۔ "میں بہری ہو گئی ہوں میں بہری ہو گئی ہوں۔" اس کے بعد یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اس جملے کو ہماری چڑ بنالیا۔ خیر آٹھ آنے کے غائب ہونے کا قصہ تو درمیان میں ہی رہ گیا اور ہم بھول گئے اس واقعے کے ایک مہینے بعد کی بات ہے کہ جمعے کا دن تھا ہم لوگ ناشتہ کر رہے تھے کہ ابا جانے نے پوچھا۔ "کیا منی ابھی تک نہیں اٹھی باجی نے کہا۔" یہ تو بیٹھی ہے ناشتہ کر رہی ہے۔ ارے! اصل میں یہ اتنا بڑا گلدان درمیان میں رکھا ہوا ہے ناں اس میں منی چھپ گئی ہے۔" سب ہنسنے لگے لیکن ہم نہیں ہنسے کیونکہ گلدان کا سن کر اچانک ہی ہمیں کچھ یاد آگیا تھا زخم ہرے ہو گئے تھے حالانکہ اس سے پہلے ہم روز ہی گلدان کو دیکھتے تھے لیکن زخم ہرے نہ ہوتے تھے۔ لیکن آج.....!!! گلدان کا نام سنتے ہی.....

ہم سیدھے کھڑے ہو گئے اور میز پر زور دار مکا مار کر کہا۔ "میں پوچھتا ہوں کہ کس نے لئے ہیں میرے آٹھ آنے فوراً واپس کر دو شرافت سے ورنہ زمین آسمان ایک کر دوں گا۔ اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

"آرام سے بیٹھ کر ناشتہ کرو اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے میں یہاں موجود ہوں۔" ابا جان کرخت آواز میں دھاڑے تو ہمیں فوراً یاد آگیا کہ ابا جان بھی ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ بالکل سیدھے ہو کر کسی بھیگی بلی کی طرح دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئے اور پھر کچھ نہ بولے لیکن زخم تو ہرے ہو ہی چکے تھے۔ کالے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ جب سب لوگ ناشتے کے بعد اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے تو ہم فوراً اس کمرے میں گئے۔ جہاں فہیم علی اور منی لوڈو کھیل رہے تھے۔ ہم ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ "سیدھی طرح میرے آٹھ آنے واپس کر دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" وہ لوگ اچانک حملے سے گھبرا گئے۔ علی نے بوکھلا کر

کہا۔

"کیسے آٹھ آنے؟ وہ تو کب کے ہضم ہو گئے ہم سب نے مل کر اس کا "کالا چورن" کھالیا تھا۔" ہمیں اپنی اس دن کی بے بسی یاد آ گئی۔

"اچھا تو ہم اس دن چھولے کھانے کے لئے تڑپ رہے تھے اور یہ لوگ چورن چاٹ رہے تھے۔"

ہماری آنکھوں میں آنسو آنے ہی والے تھے کہ منی فہیم اور علی بولے۔ "ارے یاد نہیں ان کا حصہ دینے ہی تو ہم گئے تھے۔ تو یہ مراقبہ میں بیٹھے تھے۔" علی نے کہا۔

"ہاں ہاں اور ان کے بہرے ہونے کی وجہ سے بات درمیان میں رہ گئی تھی اور ان کے حصے کا چورن وہ تو شاید باجی نے کھالیا تھا۔"

منی فوراً کھڑی ہو گئی۔ "چلو باجی کے پاس چلتے ہیں۔" چورن تھا ہمارے حصے کا اور ہم سے آگے آگے یہ لوگ تھے۔ خیر باجی کے کمرے میں پہنچے وہ پلنگ پر پاؤں لٹکائے، آنکھیں بند کئے ٹانگیں ہلا رہی تھیں۔ اور ساتھ ہی زور زور سے چٹ چٹ کی آواز ان کے منہ سے نکل رہی تھی۔ ہمارے آنے کی آواز سنتے ہی انہوں نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور جھٹ سے مٹھیاں پیچھے چھپا لیں۔ منی بولی۔ "آپ کیا کھا رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں جھوٹ بولوں تو میری زبان کالی۔" یہ کہہ کر باجی نے بغیر سوچے سمجھے جھٹ سے اپنی گز بھر لمبی زبان باہر نکال دی ایک لمحے کو ہم لوگ حیران رہ گئے۔ واقعی زبان کالی تھی۔ (ایک مہینے پرانا کالا چورن کھانے کی وجہ سے) معاملہ فوراً ہم سب کی سمجھ میں آ گیا اور سب مل کر چیخنے لگے۔ "پکڑی گئیں پکڑی گئیں۔" منی تو اتنی خوش ہوئی کہ صندوق پر چڑھ کر اونچا اونچا اچھلنے لگی۔ علی نے پاس پڑی بڑی قینچی اٹھائی اور ساتھ ساتھ قچ قچ کرنے لگا۔ فہیم کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ جھٹ اسٹیل کا جگ اور گلاس الٹا کیا اور دو پنسلیں لے کر ٹن ٹناٹن بجانے لگا۔ ہم نے سوچا ہم کیا بجائیں کچھ نہ سوجھا تو خالی تالیاں ہی دھپ دھپ بجانا شروع کر دیں۔ باجی بھی ساری شرمندگی کو بھول کر چپڑ چپڑ زبان بجانے لگیں۔ اب کمرے میں "پکڑی گئیں پکڑی گئیں۔" کے بول کے ساتھ موسیقی اور ادھم بازی کا شور کچھ اس طرح تھا قچ قچا قچ قچ ڈھم ڈھما ڈھم، ٹن ٹنا ٹن، چپڑ چپڑ، دھپ دھپا دھپ!!" یہ شور زور دار طریقے سے جاری تھا کہ بالکل اچانک سامنے دروازے سے ابا جان کمرے میں داخل ہوئے ہم سب جیسے تھے جہاں تھے کی بنیاد پر رک گئے۔ لیکن ٹن ٹناٹن کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ جب فہیم کی طرف دیکھا تو وہ آنکھ بند کئے اپنی دھن میں مست قلندر بنا جگ گلاس بجائے جا رہا تھا ہم لوگوں کے خاموش ہوتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور ابا جان کو سامنے پا کر جگ اور گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔

"کیا طوفان بدتمیزی مچا رکھا ہے؟ دماغ صحیح ہے تم لوگوں کا؟ گھر ہے یا مچھلی بازار؟ کوئی کام

نہیں ہے تم سب کو خود بے کار ہو تو کیا پورا محلّہ بھی بے کار ہے۔ تم لوگ روز اس طرح شور مچاتے ہو مجھے آج پتہ چلا اچھا ہی ہوا تمہاری ماں چلی گئی۔ اسی طرح تنگ کرتے اسے بھی۔" ابا جان خاصے غصے میں تھے کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہوئے پھر بولے۔

"آج سے کوئی مجھ سے بات نہیں کرے گا اور جس نے بات کرنے کی کوشش کی تو اپنا انجام.....!!"

یہ کہہ کر ابا جان غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ ابا جان کے جانے کے بعد ہم سب ایک ایک کر کے بیٹھ گئے اور ایک ساتھ ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیزیں جگہوں پر واپس رکھ دیں۔ منی بھی چھلانگ مار کر صندوق سے نیچے اتر آئی۔ باجی کے پاس گئی اور بولی۔ "اب کیا ہو گا باجی؟"

باجی بولیں۔ "تمہارا سر ہو گا"..... توبہ توبہ کیسے شور مچا رہے تھے سب۔" منی نانی اماں بن کر بولی۔

"اور اس شور میں سب سے زیادہ آپ شریک تھیں۔" باجی نے نانی اماں کے کان کھینچتے ہوئے کہا۔ "ابا جان تو ناراض ہو گئے ہیں اب کیا ہو گا؟"

فہیم بولا۔ "میں نے تو آج ان سے کلر پنسلیں خریدنے کے لئے دس روپے لینے تھے۔" اور میں نے ریوڑیاں کھانی تھیں ایک روپے کی۔" منی منہ بسور کر بولی۔

"تمہارا پیٹ ہے یا شیطان کی قبر۔" علی نے دانت کچکچا کر منی سے کہا۔ "دیکھیں باجی میرے ننھے سے پیٹ کو شیطان کی قبر کہہ رہے ہیں بھائی۔"

"منی نے باجی سے شکایت لگائی تو باجی بولیں۔ "خاموش ابا جان ناراض ہو گئے ہیں اور تم لوگ آپس میں لڑ رہے ہو۔"

"تو چلیں چل کر معافی مانگ لیتے ہیں۔" علی کندھے اچکا کر بولا۔ "ہنہ معافی مانگ لیتے ہیں ..... ذرا ان کے کمرے تک تو جا کر دکھاؤ کان پکڑوا کر مرغا بنوا دیں گے۔" فہیم نے کہا تو علی بولا۔ "تو کیا ہوا بن جائیں گے تھوڑی دیر کے لئے مرغا۔ آخر اسکول میں بھی تو بنتے ہیں۔"

"تم ہی بنتے ہو گے ہو نا پڑھائی کے چور جاہل....." ۔ "دیکھیں دیکھیں باجی مجھے جاہل کہہ رہا ہے۔" علی نے فہیم کا باقاعدہ گریبان پکڑ لیا۔ "بدتمیز چھوڑو اسے ابھی شور سن کر ابا جان دوبارہ آ گئے تو....." باجی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ابا جان کمرے میں آ گئے اور سب سناٹے میں۔ "ٹھیک ہے تم لوگ خوب شور اور ادھم بازی کرو میں جا رہا ہوں گھر سے ..... ہمیشہ کے لئے....." یہ کہہ کر ابا جان غصے سے باہر جانے لگے۔

"ہم سب سناٹے میں تھے اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں..... اچانک منی بھاگتی ہوئی ابا جان سے آگے نکلی اور پھر آگے جا کر پلٹی اور ابا

جان کے پیروں سے لپٹ کر روہانسی آواز میں بولی۔ "ابا جان امی جان تو ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں اب آپ بھی ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے ..... ہم کس طرح رہیں گے آپ کے بغیر اور ..... اور مجھے تو آج ریوڑیاں بھی کھانی ہیں ....."

"ابا جان جو منی کے ابتدائی جملوں سے سکتے میں آگئے تھے آخری جملہ سن کر مسکرا اٹھے۔ منی کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے بولے۔ "تم لوگوں کو چھوڑ کر میں کہیں نہیں جا سکتا تم لوگ ہی تو میری چھوٹی سی جنت ہو۔"

یہ کہہ کر ابا جان نے منی کو نیچے پٹخا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے تو ہم سب بہن بھائی خوشی کا نعرہ مارتے ہوئے ابا جان کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گئے۔

سائنسی معلومات

(۱) ٹیلی فون میں ساٹھ وولٹ بجلی ہوتی ہے۔

(۲) بلب میں آرگون (Argon) اور نائٹروجن جیسی گیسیں بھری ہوتی ہیں۔

(۳) بلب کے اندر باریک تار کا لچھا ٹنگسٹن دھات کا ہوتا ہے۔ اس دھات کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ یہ برقی رو کے راستے میں بہت زیادہ رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے لچھا گرم ہوتا ہے اور اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ اس سے روشنی نکلنے لگتی ہے۔

(۴) بلب کا لچھا جتنا زیادہ باریک ہو گا۔ اتنی ہی روشنی زیادہ ہو گی۔

(۵) آرگون (Argon) اور نائٹروجن (Nitrogen) کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ یہ لچھے کو گرم ہو کر خاکستر ہونے سے بچاتا ہے اس لئے لچھا جل کر خاک نہیں ہوتا اور بلب کے اندر سے آکسیجن (Oxygen) گیس نکال لی جاتی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے چیزیں جل تو جاتی ہیں لیکن جل کر خاک ہو جاتی ہے۔ اسی لئے لچھا بھی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔

(۶) جب انسان پانی میں بھیگا ہوا ہوتا ہے تو اس کے جسم کی ریزیسٹینس (Resistance) کمتر ہوتی ہے اور جسم سے زیادہ مقدار میں کرنٹ گزر سکتا ہے جس کی وجہ سے زبردست کرنٹ کا شاک لگ سکتا ہے۔

(۷) AC کے مقابلے میں DC کا شاک زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ AC اپنے ۳۶۰ ڈگری سائیکل کے دوران گھٹتی، بڑھتی اور صفر ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح انسان جھٹکے کھا کر چھوٹ سکتا ہے مگر DC مستقل پکڑ لیتی ہے اور ہرگز نہیں چھوڑتی۔

(۸) ایک موقعے پر تجربہ کیا گیا کہ کرنٹ کی کتنی مقدار پر ایک انسان لائف کنڈکٹر سے چھوٹ سکتا ہے تو تجربے سے معلوم ہوا کہ مرد کے لئے اس کرنٹ کی مقدار 9ma اور عورت کے لئے 6ma ہو گی۔

(۹) کپیسٹر DC کو روکتا ہے اور AC کو گزرنے دیتا ہے جب کہ انڈکٹر یا کوائل (Coil) اس کے برعکس کام کرتا ہے یعنی AC کو روکتا ہے۔ اور DC کو گزرنے دیتا ہے۔

(۱۰) پانی ہائیڈروجن (H) اور آکسیجن (O) کا مرکب ہے۔ اس مرکب میں ہائیڈروجن کے دو جوہر اور آکسیجن کا ایک جوہر شامل ہوتا ہے۔ پانی کا فارمولا یہ ہے (H_2O)

مرسلہ:۔ محمد فیصل، کراچی۔

نیا سال

ضیغم حیدی

مُبارک ہو بچو! نیا سال آیا
نئی زندگی اور نئے رنگ لایا
بھلا دو، وہ ماضی کے قصّے پُرانے
نئی زندگی کے نئے ہیں فسانے
اُتارو بدن سے پُرانے لبادے
اُمنگیں نئی ہیں، نئے ہیں اِرادے
نئے حوصلے ہیں، نئے قافلے ہیں
نئی منزلیں ہیں، نئے راستے ہیں
نئے دن ہیں اب اور راتیں نئی ہیں
نئے سال کی ساری باتیں نئی ہیں
نئے ڈھنگ سے دین و دنیا سنوارو
پرانے ہوئے سب کلینڈر اُتارو

اردو کا سب سے بڑا انشاء پرداز

ڈاکٹر اسلم فرخی

پچھلے دنوں ایک بچے سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں یوں ہی بچے سے پوچھ لیا،

"تم جانتے ہو سرسید کون تھے؟"

بچہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔

"اس وقت یاد نہیں آرہا ہے۔"

ایک اس بچے کا کیا ذکر، ہمارے اکثر بچوں کو اپنے قومی مشاہیر کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔

اس ماہ سے ہم اپنے ادبی، علمی اور تاریخی مشاہیر پر تعارفی مضامین کا نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ملک کے مشہور محقق اور ادیب جناب ڈاکٹر اسلم فرخی نے ہماری دعوت پر یہ ذمہ داری قبول کر لی ہے۔

اس سلسلہ کا پہلا مضمون پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

یہ آج سے کوئی نوے برس پہلے کی بات ہے۔

ملتان کا ایک طالب علم اپنے ایک بھائی کے پاس لاہور کی سیر کرنے آیا۔ دونوں بھائی صبح گھر سے نکلے اور لاہور کی سب سے مشہور سڑک پر پہنچے۔ دفتروں کا وقت ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے دفتر جا رہے تھے۔ ان میں انگریز بھی تھے جو بگھیوں میں بیٹھے گھوڑوں پر سوار چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک بوڑھا آدمی نظر آیا۔ چھوٹا قد، گھنی داڑھی۔ سفید براق کپڑے پہنے اپنے آپ سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی آہستہ آہستہ باتیں کرتا کبھی زور سے۔ اسے دیکھ کر گاڑی میں بیٹھے انگریزوں نے اپنی گاڑیاں روک لیں۔ گھڑ سوار بھی رک گئے۔ جب وہ بوڑھا سڑک کے دوسری طرف چلا گیا تو گاڑیاں پھر چلنے لگیں اور گھڑ سوار بھی آگے بڑھ گئے۔ ملتانی طالب علم کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی اس

نے اپنے بھائی سے پوچھا۔ یہ کون ہیں۔ جنہیں دیکھ کر سب ٹھہر گئے۔ "ارے تم انہیں نہیں جانتے۔ یہ مولوی محمد حسین آزاد ہیں۔ مشہور لکھنے والے۔ وہ نظم تمہیں یاد ہے۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی

"ہاں ہاں، یاد کیوں نہیں۔" "وہ نظم انہیں کی لکھی ہوئی ہے۔ اور وہ جو اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی کتابیں ہیں۔ وہ بھی انہیں کی لکھی ہوئی ہیں۔ بہت بڑے لکھنے والے ہیں۔ بہت کتابیں لکھی ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ بوڑھے ہو گئے ہیں اس لئے پنشن ملتی ہے۔" "اچھا۔ مگر یہ اس طرح کیوں پھرتے ہیں؟"

"کیا بتائیں، دماغ صحیح کام نہیں کرتا خلل پیدا ہو گیا ہے۔ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ مگر لوگوں میں ان کی عزت ہے کہ انہیں دیکھ کر ٹھہر جاتے ہیں سواریاں روک لیتے ہیں کہ خدانخواستہ ان کے چوٹ چسیٹ نہ لگ جائے۔" "ہاں بھائی علم والوں کی بڑی عزت ہوتی ہے۔"

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد ہماری زبان کے بہت بڑے لکھنے والے تھے۔ نثر بھی لکھتے تھے۔ نظمیں بھی لکھتے تھے بلکہ اردو زبان میں نظمیں لکھنے کا رواج انہی کی وجہ سے ہوا۔ اس وجہ سے انہیں "جدید اردو شاعری کا معمار" بھی کہا جاتا ہے۔ آزاد دلی کے رہنے والے تھے ان کے باپ دادا سب علمی آدمی تھے۔ باپ عالم بھی تھے۔ دلی سے ایک اخبار "دہلی اردو اخبار" بھی شائع کرتے تھے۔ پریس تھا کتابیں چھاپتے تھے۔ آزاد نے دلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ یہ ایک بڑا مشہور کالج تھا۔ پرنسپل انگریز پڑھانے والے بڑے لائق آزاد ہونہار اور محنتی کالج کے اچھے طالب علموں میں شمار ہوئے۔ لڑکپن ہی سے گھر کے اخبار اور پریس کی نگرانی کرتے تھے کالج سے فارغ ہوئے تو یہی کام سنبھالا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ دل میں یہ جذبہ تھا کہ خود بھی علم حاصل کرو اور اپنے ملک میں بھی علم پھیلاؤ۔ اسی جذبے سے کام میں لگ گئے مگر ہوا یہ کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی چھڑ گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آزاد اور ان کے والد نے بھی حصہ لیا۔ اس طرح کہ انگریزوں کے خلاف اپنے اخبار میں خوب خوب لکھا انگریز جیت گئے۔ جب انہوں نے دلی فتح کر لی تو آزاد کے والد کو گولی مار دی۔ آزاد جان بچانے کے لئے بھیس بدل کر نکل کھڑے ہوئے۔ شہروں شہروں گھومتے رہے۔ ادھر دلی میں ان کا سارا گھر بار لٹ گیا۔ بیوی بچے تباہ ہو کر کہیں اور چلے گئے جب ہر طرف امن چین ہو گیا۔ تو آزاد لاہور آ گئے۔ یہاں نئے سرے سے زندگی شروع کی۔ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔

بہت دن تک تعلیم کے محکمے میں چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرتے رہے پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں

عربی کے پروفیسر ہو گئے پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس میں آ گئے مگر رہے ساری زندگی تعلیم ہی کے کام میں۔ اس زمانے میں نئے نئے خیالات پھیل رہے تھے۔ انگریزی علم سے واقفیت بڑھ رہی تھی۔ سائنس کی طرف توجہ ہو رہی تھی۔ جہالت اور برے رسم و رواج کو دور کرنے کی تدبیریں سوچی جا رہی تھیں۔ یہ ملکی اور قومی اصلاح کا دور تھا۔ آزاد نے اصلاحی کاموں میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانے میں ایک انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے قائم ہوئی اس کا مقصد تعلیم کو عام کرنا۔ مفید علموں کو پھیلانا۔ فضول رسموں کو ختم کرنا اور قوم کو بیدار کرنا تھا۔ آزاد نے انجمن کے کاموں میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ انجمن کے اخبار اور رسالے کے ایڈیٹر رہے۔ انجمن میں لیکچر دیتے تھے اور اچھی باتوں کے بارے میں لکھتے رہتے تھے۔ انہوں نے انجمن پنجاب اور انجمن پنجاب کے ذریعے سے اپنی قوم کی بڑی خدمت کی۔

آزاد کو تعلیم پھیلانے کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے بہت سی درسی کتابیں لکھیں۔ اردو کی پہلی دوسری تیسری چوتھی فارسی کی ابتدائی کتابیں، قواعد کی کتابیں، قصے کہانی کے پیرائے میں تاریخ کی کتاب "قصص ہند"۔ یہ سب کتابیں آج بھی بہت مشہور ہیں۔ اردو کی پہلی دوسری کتاب کے سلسلے کو آج بھی بہترین سمجھا جاتا ہے۔ آزاد نے اسے بڑے خوش نما مفید اور عام زندگی کے حوالے سے لکھا ہے۔ "قصص ہند" اتنی مشہور ہوئی اور ایسی عمدہ کتاب سمجھی گئی کہ اس کے بعض قصے آج کی درسی کتابوں میں شامل کئے جاتے ہیں۔ "قصص ہند" میں آزاد نے کرداروں کو جیتا جاگتا اور اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ہم سارے واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے گزرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ تاریخ لکھنے کا ایسا سلیقہ بہت کم لکھنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ بچوں کی کتابیں لکھنے والوں میں آزاد کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔

آزاد کو اردو شاعری اور شاعروں سے گہری دلچسپی تھی۔ دلّی میں وہ شاعری کے ایک مشہور استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کی خدمت میں بیٹھتے تھے۔ یہاں انہیں شاعری اور شاعروں دونوں کے بارے میں بے شمار معلومات حاصل ہوئیں۔ ان معلومات سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اردو شاعری کی ایک تاریخ "آب حیات" کے نام سے لکھی کیا کتاب ہے! ہر دور کے شاعر چلتے پھرتے باتیں کرتے شعر پڑھتے، مشاعروں میں بیٹھتے، ایک دوسرے سے مقابلے کرتے نظر آتے ہیں۔ شاعروں کے لباس، حلیہ، مزاج، انداز سب کچھ سامنے آ جاتا ہے۔ تاریخ کا ہے کو ہے چلتی پھرتی فلم ہے۔ آب حیات سے پہلے اردو شاعری کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ اس وجہ سے آزاد کا کام بہت مشکل تھا لیکن وہ بہترین ادبی تاریخ لکھ گئے۔

آج کل افسانہ نگاری عام ہے۔ بڑے اچھے افسانے لکھے جاتے ہیں۔ آزاد کے زمانے میں افسانہ نگاری کا چرچا نہیں تھا۔ انہوں نے انگریزی

کے اثر سے ایسے مضمون لکھے جن کا انداز افسانے سے ملتا جلتا تھا۔ بڑے دلچسپ مضمون لکھے ہیں۔ کہیں زندگی کی سیر ہے کہیں سچ اور جھوٹ کی جنگ کا میدان ہے۔

کہیں مشہور مشہور لوگوں کا دربار سجایا ہے اور ان کی آن بان دکھائی ہے۔ چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ پڑھنے والا پڑھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے۔ مضمون کے اس مجموعے کا نام ہے۔ "نیرنگ خیال"۔ کتاب کا ہے کو ہے خاصہ تصویر خانہ ہے۔

شہنشاہ اکبر کے عہد کا حال آزاد نے "دربار اکبری" میں لکھا ہے۔ بڑی کتاب ہے مگر رنگ برنگی تصویروں کا البم معلوم ہوتی ہے، آزاد نے زبانوں کے علم کے بارے میں ایک بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ دراصل یہ علم اردو زبان میں انہی سے آیا ہے۔ بہت کام کیا ہے۔ بڑے سلیقے اور بڑی محنت سے کیا ہے اور ان کے لکھنے کا انداز بھی ایسی سجی ہوئی نثر لکھتے ہیں، اس اہتمام اور قرینے سے لکھتے ہیں کہ کسی لفظ کو ادھر سے اُدھر نہیں کر سکتے جگہ سے ہٹا کر دوسرا لفظ نہیں لکھ سکتے۔ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو اس طرح کہ جیسے ہم کمنٹری سن رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ نثر میں نظم کا مزا آتا ہے۔ آزاد کو اردو کا سب سے بڑا انشاء پرداز کہا اور سمجھا جاتا ہے واقعی وہ نثر لکھنے میں لاجواب تھے۔

آزاد شاعر بھی تھے اردو میں نظمیں لکھنے کا رواج انہی کی کوششوں سے ہوا۔ انہوں نے لاہور میں ایک ایسا مشاعرہ شروع کیا جس میں شریک ہونے والے سب شاعر پہلے سے مقرر عنوان پر نظمیں پڑھتے تھے۔ اس مشاعرے سے پہلے اردو میں نظم لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ آزاد نے شاعری میں اصلاح بھی کی۔ نئے خیال اور نئے انداز کو رواج دیا۔ اصلاحی نظمیں لکھیں، قدرتی منظر بیان کئے، بڑوں کے ساتھ بچوں کی نظمیں بھی لکھیں۔ انہوں نے اردو شاعری کی بھی بڑی خدمت کی ہے۔

آزاد جب تک دلی میں رہے بڑی شان سے رہے۔ لاہور میں ایک بالکل نئی زندگی شروع کی۔ دلی سے نکلے تو باپ اور ایک چھوٹی بچی کا صدمہ لے کر نکلے۔ بالکل تباہ ہو گئے۔ برسوں چھپتے پھرے۔ لاہور میں شروع شروع کی زندگی بڑی تکلیف اور ڈر کی زندگی تھی۔ بڑی محنت کی۔ دن رات ایک کر دیئے قوم کی خدمت میں لگے رہے۔ لکھتے رہے۔ دن بھر کالج میں سر کھپاتے۔ راتوں کو جاگتے اور کتابیں لکھتے۔ جو کچھ گزر چکا تھا اسے کوشش کے باوجود بھلا نہ سکے۔ ایران توران کی سیر بھی کر آئے مگر رہے بے چین اور پریشان۔ پھر یہ ہوا کہ ایک لاڈلی بیٹی جسے انہوں نے بڑے ارمانوں سے پالا تھا بھری جوانی میں انہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دماغ پر اثر ہو گیا۔ زندگی کے آخری بیس برس اسی کیفیت میں گزر گئے۔ اچھے بھلے بیٹھے ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں کہ اچانک انداز بدل گیا اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔

لاہور سے نکلے۔ پیدل چلتے چلتے دلی پہنچ گئے۔ وہاں ایک دوست اور ہم جماعت تھے مولوی ذکاء اللہ انہوں نے انہیں مہمان رکھا۔ بڑی خدمت کی پھر لاہور آگئے۔ یونہی عمر تمام ہو گئی اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو یعنی آج سے ۸۴ برس پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

آزاد جیسے بڑے آدمی اور بڑے لکھنے والے زبان اور ادب کا سنگھار ہوتے ہیں۔ سدا بہار ہوتے ہیں۔ ان کی کتابیں ہمیشہ پڑھی جاتی ہیں۔ انگریزی حکومت کو بھی آزاد کی خدمت کا احساس تھا۔ اس نے انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا تھا۔ مگر آزاد کا سب سے بڑا خطاب "اردو کا سب سے بڑا انشاء پرداز" ہے جو انہیں ان کے پڑھنے والوں نے دیا ہے۔

اپنے دوستوں کو آنکھ مچولی کا تحفہ دیجئے

آپ کے ایسے دوست جو آنکھ مچولی پڑھنا چاہتے ہوں لیکن اسے خریدنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، آپ انہیں آنکھ مچولی کا تحفہ مفت پیش کر سکتے ہیں آپ ان کا نام اور پتا نیچے دیے ہوئے کوپن میں لکھ کر ہمیں بھیج دیجئے۔ ادارہ ان میں سے بذریعہ قرعہ اندازی دس ساتھیوں کو اپنا ممبر بنالے گا اور انہیں ایک سال کے لئے آنکھ مچولی مفت جاری کر دیا جائے گا۔ اس طرح آپ ایک نیک کام کریں گے اور ادارہ آنکھ مچولی کو بھی ایک نیک کام کرنے کا موقع فراہم کریں گے۔

کوپن برائے تحفہ آنکھ مچولی

میرے دوست کا نام: _____ کلاس: _____

گھر کا پتا: _____

ہنسے ہنسے

منتخب لطائف

ایک سیاسی لیڈر ایک اخبار کے دفتر میں گیا اور ایڈیٹر سے بڑے غصے میں کہنے لگا۔

"کیا آپ کے اخبار میں میرے متعلق چھپا ہے کہ میں جھوٹا اور بدمعاش ہوں؟"

ایڈیٹر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں..... ہم پرانی خبریں نہیں چھاپتے۔"

مرسلہ..... شگفتہ نسیم، کراچی۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

ایک مال دار کسان نے کیمسٹ سے دوائیں خریدتے وقت اسے ہدایت کی

"دوائیں علاحدہ علاحدہ پیک کر کے اوپر لکھ دینا کہ کونسی دوا میری ہے اور کون سی میری بھینس کی۔ میں نہیں چاہتا کہ دوا میں کوئی گڑبڑ ہو جائے اور میری بھینس کو کچھ ہو جائے۔"

مرسلہ..... عبداللہ شیخ گوہر، حیدر آباد۔

شاپنگ کرتے کرتے خاتون چونک کر رک گئیں۔ اور اپنے میاں سے بولیں۔

"غضب ہو گیا..... میں آتے وقت جلدی میں بجلی کا پلگ نکالنا بھول گئی تھی..... اب کیا ہو گا؟ کہیں آگ ہی نہ لگ جائے۔"

"نہیں لگے گی آگ..... تم فکر نہ کرو۔" شوہر نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں بھی باتھ روم کا نل بند کرنا بھول گیا تھا۔"

روبینہ ناز، مخدوم پور پہوڑاں

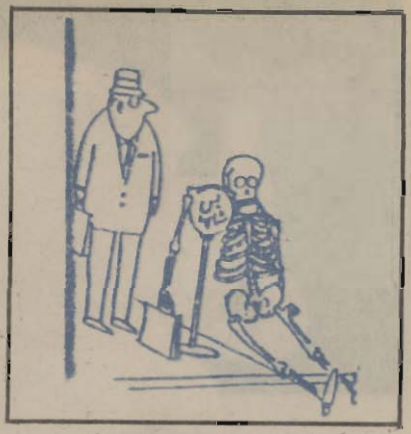

"کہو بھئی ..... سالانہ امتحانات کب سے ہیں؟"

"۱۵ مارچ سے۔"

"کچھ تیاری بھی کی ہے یا نہیں؟"

"کیوں نہیں..... دو نئے سوٹ سلوائے ہیں..... نئے جوتے خریدے ہیں اور نیا قلم خریدنے اردو بازار جارہا ہوں۔"

مرسلہ..... کشور چانڈیو، خیرپور میرس۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

کڑکڑاتی سردی میں ایک سردار صاحب لنگوٹ باندھے بیری پر چڑھے بیر کھا رہے تھے۔

ایک دوست نے پوچھا

"سردار صاحب! کیا ہو رہا ہے؟"

سردار صاحب نے کہا۔

"تم تو جانتے ہی ہو کہ مجھے دنیا میں دو ہی شوق ہیں۔ ایک کھانے کا۔ دوسرا پہننے کا۔

مرسلہ..... نورین اشفاق، خانیوال۔

امتحان میں بیٹے کی کامیابی پر باپ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ کھانے کی میز پر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور فخریہ انداز میں مسکرا کر بولا۔

"جانتی ہو بیگم..... گڈو کو میرا دماغ ملا ہے۔"

"ضرور ملا ہو گا۔" بیگم نے سوکھے منہ سے جواب دیا۔ "میں بہت دنوں سے آپ کو غائب دماغ محسوس کر رہی ہوں۔"

مرسلہ..... یاسر بن صغیر، کراچی۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

راتوں رات دولت مند بن جانے والے ایک شخص نے اپنا خاندانی شجرہ نسب مرتب کرنے کی ٹھانی۔ اس مقصد کے لئے اس نے ریسرچ کے ایک ماہر کی خدمات حاصل کیں۔ چند ہفتے بعد اس سرمایہ دار کے ایک دوست نے پوچھا۔

"کہو! ریسرچ کے ماہر کا کام کیسا چل رہا ہے؟"

"بہت اچھا..... سچ پوچھو تو اس نے کھوج لگا کر میرے بزرگوں کے بارے میں اتنا کچھ دریافت کر لیا ہے کہ اب میں اسے اپنی زبان بند رکھنے کے لئے ماہانہ رقم دے رہا ہوں۔"

مرسلہ..... حارث شکیل، کراچی۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

استاد (شاگرد سے) پانی کا کیمیائی فارمولا بتاؤ۔

شاگرد: H,I,J,K,L,M,N,O

استاد..... یہ کیا بدتمیزی ہے؟

شاگرد! سر آپ ہی نے تو بتایا تھا۔ H to O

مرسلہ..... سید عابد مہدی کاظمی، ایبٹ آباد۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

گاہک: جب میں نے آپ سے موٹر سائیکل خریدی تھی تو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ تین ماہ تک موٹر سائیکل چلاتے ہوئے جو کچھ ٹوٹے گا آپ اس کی جگہ دوسرا سامان لگا دیں گے۔

دکاندار: جی ہاں۔ فرمائیے کیا ٹوٹ گیا ہے؟

گاہک: سامنے کے چار دانت ٹوٹ گئے ہیں۔

مرسلہ..... حسیب احمد، کراچی

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

ایک زرعی گریجویٹ ایک کاشت کار کے پاس پہنچا اور بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ ابھی تک کاشت کاری کے وہی دقیانوسی طریقے اپنائے ہوئے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس درخت سے دس سیر سیب بھی حاصل نہیں کر سکتے۔"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو" کاشت کار نے سر ہلایا "کیونکہ یہ ناشپاتی کا درخت ہے۔"

مرسلہ..... حسیب احمد، کراچی

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

استاد شاگرد سے! بادل کیوں برستے ہیں۔

شاگرد! جناب اگر بادلوں کو زمین پر کوئی مزیدار چیز نظر آجاتی ہے تو بادلوں کے منہ سے پانی ٹپکتا ہے۔

مرسلہ..... رانا فیض علی، صادق آباد۔

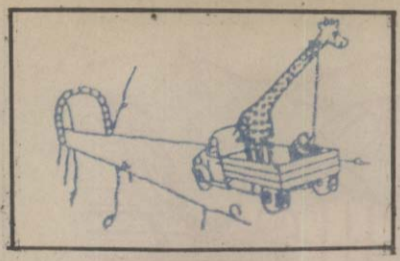

ایک دیہاتی جہاز میں سفر کرنے کی غرض سے ایئرپورٹ پر گیا۔ جہاز چلنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے کہ اچانک اس کہ ذہن میں کچھ خیال آیا اور وہ فوراً پائلٹ کہ پاس گیا اور کہا

"بھائی جہاز میں تیل پورا ہی ہے نا"؟

پائلٹ بولا..... جی جناب جہاز میں تیل پورا ہے مگر آپ کس لئے پوچھ رہے ہیں؟

دیہاتی..... اس لئے کہ جہاز اوپر جا کے بند نہ ہو جائے اور پھر آپ ہمیں دھکا لگانے کے لئے نہ کہنا، میں دھکا نہیں لگاؤں گا۔

مرسلہ..... رانا عبدالقیوم شاہد، سنجر پور۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

باپ: (بیٹے سے) "پیدل چلیں یا بس پر؟"

بیٹا: "آپ کی مرضی..... ویسے اگر پیدل چلیں تو مجھے گود میں اٹھا لیجئے گا۔"

مرسلہ..... عبدالرشید، سوھدرہ۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

ایک فقیر دونوں ہاتھوں میں کشکول لئے بھیک مانگ رہا تھا

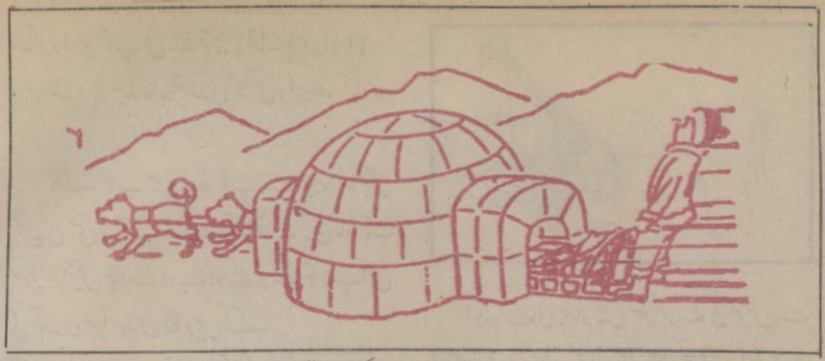

ایک آدمی نے ایک روپیہ اس کے کشکول میں ڈال دیا اور پوچھا۔ "بابا یہ دونوں ہاتھوں میں کشکول کیوں ہے؟"

فقیر نے جواب دیا۔ "بڑھتے ہوئے کاروبار کے پیش نظر میں نے برانچ کھولی ہے۔"

مرسلہ..... فدا کریم، پسنی مکران۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

ایک مریض ڈاکٹر کے پاس آیا ڈاکٹر نے اسے نسخہ لکھ دیا۔ مریض مشورے کی فیس دیئے بغیر ہی تیزی سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد وہی مریض دوبارہ واپس آیا اور ڈاکٹر سے کہا کہ آپ نے پرہیز تو بتایا ہی نہیں یعنی میں کیا کھاؤں اور کیا نہ کھاؤں؟ ڈاکٹر نے بھنا کر جواب دیا کہ جو کچھ مرضی ہے کھایئے لیکن میری فیس تو نہ کھایئے۔

مرسلہ..... محمد جنید ہارون، کراچی۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

استاد (شاگرد سے)۔ "اس نے کام کیا اور کرتا ہی چلا گیا۔" کی انگریزی کرو۔

شاگرد (تھوڑی دیر سوچ کر)۔ "ہی ڈن اے ورک اینڈ ڈن ڈنا ڈن، ڈن ڈنا ڈن

مرسلہ..... محمد جنید ہارون، کراچی۔

باپ:۔ بیٹے تم رات کو کتنے بجے تک پڑھتے رہتے ہو؟

بیٹا:۔ ابو ۱۱ گیارہ بجے تک۔

باپ (حیرانگی سے) لیکن آجکل تو لوڈ شیڈنگ ہے اور بجلی تو ۹ بجے چلی جاتی ہے۔

بیٹا:۔ (گھبراتے ہوئے) دراصل ابو جان میں پڑھنے میں اتنا مگن رہتا ہوں کہ بجلی کے جانے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

مرسلہ..... محمد جنید ہارون، کراچی۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

دو سپاہی آپس میں لڑ پڑے۔

دونوں کو کمانڈر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے دونوں کا کورٹ مارشل کرتے ہوئے کہا "دفع ہو جاؤ۔ ہمیں لڑنے والے سپاہی نہیں چاہئیں۔"

مرسلہ..... جنید اختر، کراچی

WHAT'S NEW

تیز رفتار "رارا ۱۵"

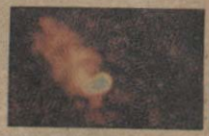

رارا ۱۰ ٹویوٹا کمپنی کی اس کار کا نام ہے جو سورج کی توانائی سے چلتی ہے۔ کار میں سلیکون سولر سیل اور نکل زنک بیٹری استعمال کی گئی ہے اور یہ پچھتر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتی ہے۔

طاقتور ریڈیو ٹیلی اسکوپ

نیو میکسیکو کے قصبے پائی ٹاؤن میں نصب یہ ریڈیو ٹیلی اسکوپ ایک بڑے تحقیقاتی مرکز کا حصہ ہے کچھ عرصہ قبل اس مرکز نے اپنی دس میں سے چار ٹیلی اسکوپ کے ذریعے زمین سے ۳۳۳ ملین نوری سال کے فاصلے پر ایک کہکشاں دریافت کی تھی جس میں سے ایک کاسمک جیٹ کی تصویر نظر آ رہی ہے۔

گولڈ میڈل سائیکل

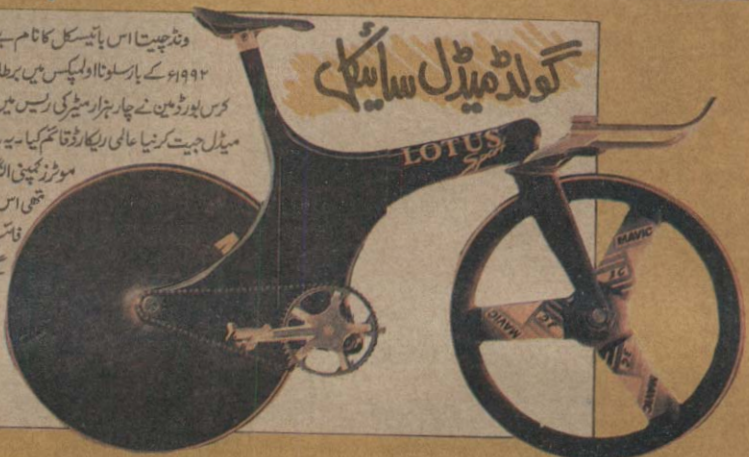

ونڈ چیتا اس بائیسکل کا نام ہے جس پر سوار ہو کر ۱۹۹۲ء کے بارسلونا اولمپکس میں برطانوی سائیکلسٹ کرس بورڈمین نے چار ہزار میٹر کی ریس میں حصہ لیا اور گولڈ میڈل جیت کر نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ یہ بائیسکل جنرل موٹرز کمپنی انگلینڈ نے تیار کی تھی اس کے پہیئے کاربن فائبر سے بنائے گئے ہیں۔ سائیکل کے ڈھانچے میں ٹیٹینیم کا استعمال کیا گیا ہے۔

روبوٹ جیپ

فوجی مقاصد کے استعمال کے لئے یہ حیرت انگیز جیپ بغیر ڈرائیور کے چلتی ہے۔ پہلے سے طے شدہ منزل تک پہنچنے کے لئے راستوں کی شناخت کیمرہ کے ذریعہ کرتی ہے۔ اس جیپ میں اسٹیئرنگ، بریک، پٹرول اور جاسوسی آلات کو کمپیوٹر کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اس جیپ کو فوجی مرکز پر بیٹھا ایک

حفاظت اپنی جو آپ کرتا ہے
سکوں سے اس جہان میں جیتا ہے

سنہری روشنی کی لمبی لمبی دھاریوں نے سارے جنگل کو روشن کر دیا ہے۔ صبح صادق کی ہلکی دھوپ میں شبنم جھلمل جھلمل کر رہی ہے۔ ہوا میں صنوبر کی خوشبو اور قدرتی برف کی مہک بسی ہوئی ہے۔ سرمئی بھیڑیوں کا ایک غول اس منظر میں نمودار ہوتا ہے۔ ان کی تعداد آٹھ ہے۔ یہ غول تیزی سے ایک جانب چلا جا رہا ہے۔ گروپ کی قیادت ببر کر رہا ہے۔ جو نہ صرف قائد ہے بلکہ باپ بھی۔ اس کے پیچھے تیزی سے لپکتی ہوئی گوری ہے جو ماں ہے اور باقی سب ان کے بچے۔ چار بچے تو وہ ہیں جو اب بڑے ہو چلے ہیں اور باقی دو ان سے پہلی نسل کے ہیں اور اب ماشاء اللہ جوان ہیں۔ ببر نے اپنی بالوں بھری دم کو جھنڈے کی طرح اوپر اٹھا رکھا ہے اور مخصوص رفتار سے دوڑا چلا جاتا ہے۔ پورا خاندان اس کی پیروی کر رہا ہے۔ یہ لوگ اس وقت شکار کی تلاش میں ہیں کیونکہ پچھلے تین دن سے وہ بھوکے ہیں اور ایک کھیل بھی اڑ کر ان کے منہ تک نہیں آئی۔

اچانک ببر رکا۔ دم نیچے آ گئی۔ بے قراری سے جھکا۔ نتھنے پھُلا کر ہوا میں سونگھا۔ چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ انسان کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کا مطلب تھا..... آفت..... بڑی آفت۔ زنجیروں کی کھنکھناہٹ ہوا کے دوش پر وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ بھیڑیوں نے بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی اور اس کام میں ذرا بھی دیر نہ کی۔ دم دبائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ایک جانب کو کھسک لئے۔

تھوڑی دیر بعد ببر نے دوبارہ سر اٹھایا۔ دم کا جھنڈا لہرایا۔ ہوا میں لمبے لمبے سانس لے کر کچھ سونگھا۔ اس بار اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا۔ قریب ہی کہیں سے ہرن کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ ہرن کے مزے دار گوشت کے تصور نے بھوک کو بھڑکا دیا۔ گروپ کے بقیہ افراد نے بھی ہرن کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ بے چینی سے ببر کی تھوتھنی کو چوم رہے تھے۔ یہ گویا ایک طرح کا اشارہ تھا کہ "پاپا اب جلدی کیجئے۔" ببر بہرحال قائد تھا پہل اسی کو کرنا تھی۔ اس نے قدم بڑھایا تو سارا گروپ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جلد ہی انہوں نے ہرن کو جا لیا جو جھاڑیوں میں کھڑا ایک نرم شاخ کو چبا رہا تھا۔ ہرن کے قریب پہنچ کر یہ لوگ زیادہ محتاط ہو گئے۔ لیکن پھر بھی ہرن نے انہیں دیکھ ہی لیا۔ ببر بمعہ اہل و عیال ہرن سے اس قدر قریب تھا کہ بھاگنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہرن خوب موٹا تازہ اور صحت مند تھا۔ راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے اس نے مقابلہ کی ٹھانی۔ دوسری طرف ببر بھی جہاندیدہ تھا۔ سب صورتحال سمجھ گیا۔ پر کیا کرتا تین دن سے بھوکا تھا..... نظروں ہی نظروں میں ہرن کو تولا۔ اس کے پورے خاندان کے لئے کافی تھا۔ غرا کے دھمکی دی..... دانت نکوس کر ڈرایا اور اپنے خاندان کی طرف دیکھ

کر یہ اشارہ بھی دیا کہ "پورے آٹھ ہیں..... دیکھ لو لڑو گے تو مارے جاؤ گے۔" دوسری طرح ہرن بھی جانتا تھا کہ سب کشتیاں جل چکی ہیں۔ اللہ اور اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ بھیڑیئے ہیں تو کیا..... ؟ اور آٹھ ہیں تو کیا؟ بھاگوں گا تب بھی مارا جاؤں گا..... پھر کیوں ذلت کی موت مروں ..... بہادروں کی طرح لڑتے ہوئے کیوں جان نہ دوں....." یہی سوچ کر وہ ڈٹ گیا۔ ببر گوری اور بچوں نے نیم دائرے کی شکل میں ہرن کو گھیر لیا تھا پھر ببر نے آزمائشی حملہ کیا کہ ہرن کمزور پڑا تو دھر لیں گے اور اگر مقابلہ سخت ہوا تو....." ببر کا دوسرا خیال درست نکلا۔ جونہی وہ ہرن کی طرف بڑھا ہرن نے اپنے کھروں سے الٹا اس پر حملہ کر دیا۔ ببر نے جھکائی دی اور صاف بچ گیا۔ چھوٹے بچوں میں سے ایک کو بہت غصہ آیا..... ہتک سی محسوس ہوئی کہ ہم بھیڑیئے اور یہ ہرن اس کی یہ مجال کہ میرے پاپا پر حملہ کرے..... غراتا ہوا ہرن پر جھپٹ پڑا۔ اور پچھلی ٹانگ کو بھنبھوڑنے کی کوشش کی۔ مگر ہرن نے اگلے کھر سے ایسا پنچ لگایا کہ بچہ لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ کندھے میں شدید درد کا احساس ہوا۔ حیرت سے ہرن کو دیکھا پھر ببر کو۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا ہے۔ لیکن ببر سمجھ گیا تھا کہ یہاں دال نہیں گلے گی۔ جب کسی کو اپنی قوت کا اندازہ ہو جائے اور وہ اپنی حفاظت خود کرنے کا عزم کر لے تو بڑے بڑوں کی دال نہیں گلتی۔ ببر نے بھی اس ہرن کا خیال چھوڑا اور اپنی راہ لی۔ پورا خاندان حسب معمول اس کے پیچھے تھا۔ وہ درختوں کے جھنڈ میں سے گزرے۔ پگڈنڈیوں پر چلے۔ پھر اس سڑک کو عبور کیا جس پر سے برف صاف کر دی گئی تھی۔ بالآخر وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں برف نرم اور دبیز تھی۔ یہاں چلنا بھی کافی دشوار ہو رہا تھا۔ پاؤں برف میں دھنس دھنس جاتے تھے۔ بھیڑیوں کی بھوک عروج پر تھی۔ ببر نے بے چین ہو کر برف میں منہ مارا اور ندیدے پن سے برف چاٹنے لگا مگر یہ کیا..... ہوا میں ایک مخصوص بو محسوس ہو رہی تھی۔ ہرن کی بو ..... اس نے گردن اٹھا کر ہوا میں چند لمبی لمبی سانسیں لیں..... ہرن کہیں نزدیک ہی موجود تھا۔ وہ بو کے تعاقب میں چل پڑا۔ خاندان اس کے تعاقب میں تھا۔ انہیں برف کی موٹی تہہ پر ہرن کے پاؤں کے تازہ نشان بھی ملے۔ انہیں زیادہ دور تک نہیں جانا پڑا۔ ایک ہرن برف میں لیٹا آرام کر رہا تھا۔ یہ بوڑھا اور کمزور سا ہرن تھا۔ بھیڑیئے اس کے قریب جا کر رک گئے۔ نصف دائرے کی شکل میں اس کے گرد گھیرا ڈالا اور اچانک حملہ کر دیا۔ ہرن نے مزاحمت کی مگر کمزور سی کوشش۔ بقا کی کمزور کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ ہرن بھی جلد ہی چت ہو گیا۔ بھیڑیوں نے پیٹ بھرا۔ چہروں سے مردنی رخصت ہوئی۔

آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ہو ہو کرنا شروع کر دیا۔ یہ خوشی کا گیت تھا۔ پیٹ بھر جائے تو ایسی ہی مستیاں سوجھتی ہیں۔

باجی

افضال عاجز

عجب شے ہے یہ نام جس کا ہے تاجی
مگر کیا کروں میری لگتی ہے باجی

بہت نیک ہے یوں تو ہے وہ نمازن
طبیعت میں لیکن نہیں ہے توازن

ابھی سیر ہے تو ابھی ہے یہ ماشہ
ابھی مرچ کالی ابھی ہے بتاشہ

نہ امّی کا اس کو نہ ابّا کا ڈر ہے
یہ ان کی چہیتی ہے نورِ نظر ہے

اسے ہے نہ پڑھنے پڑھانے سے مطلب
اگر ہے تو مُرغا بنانے سے مطلب

سویرے سویرے اُٹھاتی ہے مجھ کو
پھر اسکول کو یہ بھگاتی ہے مجھ کو

کبھی حکم دے یہ اُٹھا لاؤ تختی!
نہ لکھو گے گر تو بڑی ہو گی سختی

خدا جانے جائے گی کس دن یہ سسرال
ٹلے گا مرے سر سے باجی کا جنجال

خدایا میں تجھ سے دُعا مانگتا ہوں
نہ یہ پوچھ مجھ سے میں کیا مانگتا ہوں

کرشمہ خدایا تو اپنا دکھا دے
مری پیاری باجی کو بچّہ بنا دے

میں باجی کو اپنی پھر ایسی سزا دوں
پکڑ کان سے اس کو مُرغا بنا دوں

لگاؤں وہ ڈنڈے کہ یاد آئے نانی
سُناتی پھرے سب کو اپنی کہانی

دوسرا جسم

محمد عادل منہاج

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی اس کے سینے پر چڑھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں باہر کو اُبلی پڑ رہی تھیں۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا اس لئے اسے نظر نہیں آرہا تھا کہ سینے پر کون سوار ہے صرف ایک ہیولا سا دکھائی دے رہا تھا۔ "یہ — یہ کون ہے؟ — ڈاکو — قاتل — یہ گھر میں کیسے گھسا؟ — اس کی مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ — مم — میں کیا کروں — کس کو مدد کے لئے پکاروں؟ یا اللہ — مجھے بچالے — بچ — چا —" بے ربط خیالات اس کے ذہن میں آرہے تھے اور پھر ایک تیز چیخ اس کے حلق سے بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی سینے پر سوار شخص اسے چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ ایک دم

کمرے میں روشنی ہو گئی۔
"کیا ہوا لیاقت ـــ ارے! تم اتنے خوفزدہ کیوں ہو ـــ کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے۔؟" ایک نوجوان اس کے سرہانے کھڑا پریشانی کے عالم میں پوچھ رہا تھا۔
"وہ ـــ وہ چلا گیا؟" لیاقت بستر پر اٹھ بیٹھا۔ وہ بے حد خوفزدہ نظر آرہا تھا اور اپنی گردن مسل رہا تھا۔
"کون چلا گیا؟ کیا کہہ رہے ہو تم!" نوجوان الجھن کے عالم میں بولا۔
"بھائی جان ابھی ابھی کوئی اس کمرے میں موجود تھا وہ میرا گلا گھونٹ رہا تھا۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔
"گلا گھونٹ رہا تھا!" نوجوان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
"ہاں ـــ کسی نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔"
"مگر یہاں تو کوئی نہیں ـــ تم ضرور خواب میں ڈر گئے ہو۔"
"نہیں۔" اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ ضرور کوئی ڈاکو یا چور ہو گا۔ وہ میرا گلا گھونٹ رہا تھا میرے حلق سے چیخ نکلتے ہی وہ بھاگ نکلا۔"
"پتہ نہیں.... تم کیا کہہ رہے ہو؟ ٹھہرو پہلے میں گھر کا جائزہ لے لوں۔" نوجوان کمرے سے باہر نکلا اس کمرے کے برابر میں ایک اور کمرہ تھا۔ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ اندر سے بند تھا۔ وہ آگے بڑھا اور کچھ دیر چلنے کے بعد ایک اور کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں ایک چارپائی پر ایک شخص سو رہا تھا ـــ پھر اس نے ڈرائنگ روم، باورچی خانے اور سارے غسل خانے دیکھ ڈالے اور واپس اسی کمرے میں آیا۔ "تمہیں ضرور وہم ہوا ہے پورے گھر میں کوئی نہیں اور بیرونی دروازہ بھی اندر سے بند ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی چور یا ڈاکو نہیں گھسا۔ یوں بھی چور تو چوری کرنے آتے ہیں بھلا کوئی چور گھر میں گھس کر تمہارا گلا کیوں گھونٹنے لگا۔!!"
"مم ـــ مگر ـــ مجھے وہم نہیں ہوا۔" لیاقت نے احتجاج کیا۔
"بعض اوقات ڈراؤنے خواب ذہن پر سوار ہو جاتے ہیں۔ تم ذہن پر زیادہ زور مت دو۔ بس اس خیال کو ذہن سے جھٹک دو اور سونے کی کوشش کرو۔ شاباش ـــ" نوجوان نے کہا اور کمرے کی لائٹ بجھا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھے رہنے کے بعد لیاقت بھی لیٹ گیا۔ وہ اندھیرے میں لیٹا دروازے کو گھور رہا تھا۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

"شرافت بتا رہا تھا کہ تم سوتے میں ڈر گئے تھے۔" ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا اس کی صحت کافی اچھی تھی وہ ناشتے کی میز پر اخبار تھامے بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ لیاقت، رات والا نوجوان شرافت اور ایک لڑکی بھی تھی۔ یہ کرامت حسین کا گھرانہ تھا۔ ان

کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور وہ اپنے تین بچوں شرافت، لیاقت، اور صباحت کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

"مم — میں ڈرا نہیں تھا پاپا — مجھے اب بھی یقین ہے کہ رات کسی نے میرا گلا دبانے کی کوشش کی ہے۔"

"نہیں بھئی — تم نے واقعی خواب میں کسی کو ایسا کرتے دیکھا ہو گا۔" کرامت حسین بولے۔

"یوں بھی تم خاصے کمزور دل واقع ہوئے ہو۔" صباحت مسکراتے ہوئے بولی۔

"کمزور دل ہوتا تو اس وقت تم میرے چنے پڑھ رہی ہوتیں۔" لیاقت نے اسے گھورا۔

"الٹی سیدھی باتیں منہ سے مت نکالا کرو۔" شرافت نے اسے ڈانٹا پھر صباحت سے بولا۔ "ذرا نمک ادھر سرکاؤ۔" صباحت نے نمک دانی اسے پکڑائی اور وہ اسے اُبلے انڈے پر چھڑکنے لگا۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

شرافت گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر زور سے ہلایا۔ وہ ایک دم چونک گیا اور کروٹ بدلتے ہوئے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اس کا شانہ ہلانے والی واپس دروازے کی طرف جا رہی تھی پشت پر اس کے لمبے لمبے بال لہرا رہے تھے۔ پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔

"آج اتنی جلدی صبح ہو گئی۔" شرافت بڑبڑاتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اکثر جب اسے اٹھنے میں دیر ہو جاتی تو صباحت اسے اٹھا دیتی تھی مگر آج تو اس نے کچھ جلدی ہی اٹھا دیا تھا۔ سامنے دوسرے پلنگ پر لیاقت بھی ابھی تک سو رہا تھا۔ اس نے چپلیں پہنیں اور آنکھیں ملتا ہوا کمرے سے باہر نکلا مگر باہر تو ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پھر اس کی نظر برابر والے کمرے میں پڑی۔ اس نے کمرے کے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ اندر سے بند تھا۔

"یہ کیا — صباحت تو سو رہی ہے — پھر مجھے کس نے اٹھایا؟" اس کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا پھر اچانک اس کے ذہن میں دھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اسے اٹھانے والی جب کمرے سے نکل رہی تھی تو اس نے اس کی پشت پر لمبے لمبے بال لہراتے دیکھے تھے جب کہ صباحت کے تو لڑکوں کی طرح شانوں تک بال تھے، پھر — پھر وہ کون تھی؟ — ان کے گھر میں تو کوئی اور عورت ہے ہی نہیں! ایک لمحے کو خوف کی ایک لہر سی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر کل رات کی طرح دوبارہ پورے گھر کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ تھی۔ وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ میں گم تھا۔ اسے کل رات لیاقت کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ یاد آ رہا تھا جسے اس نے اس کا خواب قرار دیا تھا تو کیا خود اس نے بھی کوئی خواب دیکھا ہے؟

"خیر تو ہے بھئی آج تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" کرامت حسین نے شرافت کے

چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ک ک۔۔۔ کوئی ایسی بات نہیں پاپا۔" وہ گھبرا کر بولا اور توس کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا۔
"اس کا مطلب ہے کوئی بات ہے ضرور۔" وہ بولے۔
"جی۔ آپ سن کر مذاق اڑائیں گے۔" وہ ہچکچاتا ہوا بولا۔
"کبھی کبھی آپ کو بھی مذاق اڑوا لینا چاہئے بھائی جان۔" لیاقت چائے کی چسکی لیتا ہوا بولا۔
"تم بتاؤ کیا بات ہے؟" کرامت حسین نرمی سے بولے۔ شرافت نے آہستہ آہستہ رات والا واقعہ سنا دیا۔
"واہ بھائی جان کل تو آپ لیاقت کو سمجھا رہے تھے اور اب خود بھی خواب کو حقیقت سمجھنے لگے۔" صباحت بولی۔
"میں نے اپنے ہوش و حواس میں کسی عورت کو کمرے سے نکلتا دیکھا تھا۔" وہ تیزی سے بولا۔
"اب تم ہی بتاؤ بھلا کہ ہمارے گھر میں کونسی عورت ہے؟ لیاقت تو وہمی تھا ہی اب تم پر بھی اس کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔" کرامت حسین نے منہ بنا کر کہا۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

وہ چاروں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ٹی وی کے اوپر رکھے ٹائم پیس میں دس بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔

"بور فلم ہے بھئی۔ میں تو سونے چلی۔" صباحت جمائی لیتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔
"ظاہر ہے تاریخی فلمیں تو تمہیں بور ہی لگیں گی۔" لیاقت نے منہ بنایا۔
"تو اور کیا ٹی وی تو تفریح کے لئے ہوتا ہے۔ یہ کیا کہ سارا دن کالج میں بھی پڑھائی کرو پھر آ کر ٹی وی پر بھی تاریخ اور معلومات عامہ کے پروگرام دیکھو۔" صباحت منہ بناتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گئی اور اپنے کمرے میں آئی۔ لائٹ جلا کر جونہی وہ مڑی اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ رائٹنگ ٹیبل کے سامنے رکھی کرسی پر کوئی عورت بیٹھی تھی۔ وہ میز پر جھکی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی جونہی لائٹ جلی اس نے سر اوپر کو اٹھایا۔ اس کا چہرہ بے حد بھیانک تھا۔ توے کی طرح سیاہ رنگت، بڑی بڑی باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ صرف اس کے بال بے حد خوبصورت اور لمبے تھے۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی صباحت کے حلق سے ایک تیز چیخ نکلی اور وہ چکرا کر گر پڑی۔
دوڑتے قدموں کی آواز گونجی پھر کرامت حسین، دونوں بیٹوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ صباحت فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔
"ارے! اسے کیا ہوا؟" شرافت کے منہ سے نکلا۔ کرامت حسین فوراً فرش پر بیٹھ گئے اور صباحت کو ہلایا جُلایا۔
"صباحت ۔۔۔ بیٹی ۔۔۔ آنکھیں کھولو ۔۔۔ کیا ہوا

تمہیں؟" وہ پریشانی کے عالم میں بولے۔

"لیاقت، بھاگ کر پانی لے آؤ۔" شرافت نے کہا۔ لیاقت تیزی سے کمرے سے نکل گیا اور فوراً ہی گلاس میں پانی لے کر آیا۔ کرامت حسین نے اس سے گلاس لے کر پانی کے چھینٹے صباحت کے چہرے پر مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"صباحت۔ خیر تو ہے بیٹی، کیا ہوا تھا تمہیں؟" کرامت حسین بے چین ہو کر بولے۔

"پاپا — وہ — وہ — میرے کمرے میں — ایک چڑیل تھی۔" صباحت بے حد خوفزدہ انداز میں بولی۔

"چڑیل —! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" کرامت حسین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یقین کریں پاپا! وہ — وہ اس کرسی پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ جونہی میں نے لائٹ جلائی اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اف کس قدر خوفناک چہرہ تھا اس کا!" صباحت کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" کرامت حسین الجھن کے عالم میں بولے اور میز کی طرف بڑھے۔ میز پر ایک پیڈ پڑا تھا جس کے سب سے اوپر والے صفحے پر آڑی ترچھی لائنیں پڑی ہوئی تھیں۔

"یہ — یہ دیکھیں پاپا۔ یہ لائنیں اس چڑیل نے لگائی ہیں۔" صباحت بھی ادھر آ گئی تھی۔

"ضروری تو نہیں۔ تم بھی بے خیالی میں اس طرح کرتی رہتی ہو۔ یہ لائنیں بھی تم نے ڈالی ہوں گی۔" کرامت حسین نرم آواز میں بولے۔

"نہیں — یہ — یہ اس چڑیل نے ڈالی ہیں۔" صباحت پر زور لہجے میں بولی۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کبھی کوئی لیاقت کا گلا گھونٹتا کبھی شرافت کو کوئی عورت نظر آتی ہے اور تمہیں چڑیل دکھائی دیتی ہے۔ نہ جانے یہ ایک دم اس گھر میں کس قسم کے چکر چل پڑے ہیں — خیر اب تم لوگ سو جاؤ — مجھے صبح اس سلسلے میں کچھ کرنا ہی ہو گا۔"

"مم — میں اس کمرے میں نہیں سوؤں گی۔" صباحت خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے تم میرے کمرے میں آ جاؤ۔" کرامت حسین بولے۔

صباحت اپنے والد کے کمرے میں لیٹ گئی۔ وہ اب بھی خوفزدہ سی تھی۔ کرامت حسین بھی اپنے پلنگ پر لیٹ گئے وہ سوچ میں گم تھے کہ آخر ان کے بچوں کے ساتھ یہ کس قسم کے واقعات پیش آ رہے ہیں۔ کیا یہ سب ان کا وہم ہے؟ اگر کسی ایک کی بات ہوتی وہ اسے ..... وہم، خواب کہہ کر ٹال دیتے مگر ہر بچے کے ساتھ کوئی نہ کوئی عجیب و غریب واقعہ پیش آنے کے بعد وہ اسے وہم بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ روشن خیال آدمی تھے۔ بھوت پریت اور آسیب پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

مگر اب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کیا واقعی آسیب کا کوئی وجود ہے! انہی سوچوں میں انہیں نیند آگئی۔

رات خاصی گزر چکی تھی جب کرامت حسین کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں سردی سی محسوس ہو رہی تھی انہوں نے لحاف گردن تک کھینچ لیا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت انہیں محسوس ہوا کہ کوئی ان کا لحاف کھینچ رہا ہے لحاف اتر کر سینے تک آگیا تھا۔ ان کے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے فوراً آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ان کے پلنگ کی پائینتی کی طرف ایک عورت کھڑی تھی۔ اندھیرے میں اس کا صرف ہیولا سا نظر آرہا تھا اور پنکھے کی ہوا سے اس کے بال اڑتے نظر آرہے تھے۔ ان کے ذہن میں فوراً شرافت اور صباحت والا واقعہ گھوم گیا۔

"تت ... تو ... کیا یہی وہ عورت چڑیل ہے ... مگر یہ کون ہے اور اس گھر میں کیسے گھسی ... بھوت یا چڑیل ... آسیب ہے یا روح ..." پھر اچانک انہوں نے ایک فیصلہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بجلی کی سی تیزی سے پلنگ سے اترے اور فوراً لائٹ جلا دی۔ مگر یہ کیا ...؟ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ کمرہ تو خالی تھا۔ بس وہ تھے یا پھر ایک پلنگ پر صباحت بے خبر سو رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں الجھن دوڑ گئی اور پیشانی پر بل پڑ گئے۔ پھر انہوں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ چارپائیوں اور میز کے نیچے جھانکا۔ پردے ہٹا کر دیکھے، دروازہ کھول کر ادھر ادھر جھانکا اگر ان کے بیچے اس وقت انہیں یہ سب کرتا دیکھ لیتے تو یقیناً حیرت سے دانتوں تلے انگلیاں داب لیتے۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

"ان سب واقعات کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے تعویذ گنڈے کرنے والے کسی پیر فقیر کے پاس جانے کی بجائے کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔" کرامت حسین بولے جو اس وقت ملک کے مشہور ماہرِ نفسیات صفدر علی کے کلینک میں بیٹھے تھے۔

"آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے اگر آپ بھی ہمارے ملک کی اکثریت کی طرح پیروں فقیروں کے چکر ... میں پڑ جاتے تو اپنا وقت اور پیسہ دونوں برباد کرتے اور یہ واقعات جوں کے توں جاری رہتے۔" صفدر علی نے کہا۔

"مگر جناب آخر یہ ہمارے گھر میں ہو کیا رہا ہے۔ میں آسیب کو نہیں مانتا مگر اب میرا یقین متزلزل ہو رہا ہے۔"

"ان واقعات کی توجیہہ اگر میں پیش کروں تو شاید آپ کی سمجھ میں نہ آئے لہٰذا میں اس کا علاج بتا دیتا ہوں اور علاج یہ ہے کہ آپ لوگ نمک کھانا چھوڑ دیں۔" صفدر علی بولے۔

"جی کیا فرمایا آپ نے! نمک کھانا چھوڑ دیں۔" کرامت حسین کو ان کی بات پر یقین نہیں آیا۔

"جی ہاں۔ آپ کے گھر میں نمک بہت کھایا جاتا ہے لہٰذا چند ماہ تک تو نمک بالکل استعمال نہ

کریں اس کے بعد کم مقدار میں استعمال کریں۔ یہ واقعات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

"مم ــ مگر جناب نمک کھانے سے ان واقعات کا کیا تعلق!" کرامت حسین حیرانگی سے بولے۔"

"میں نے کہا تھا ناکہ اس کی توجیہہ شاید آپ کی سمجھ میں نہ آئے خیر میں تھوڑی سی وضاحت کرتا ہوں۔ دراصل روحانیت کے نقطۂ نظر سے ہر انسان کے جسم کے اوپر ایک اور جسم موجود ہوتا ہے جو روشنیوں سے بنا ہوتا ہے۔" صفدر علی بولے۔

"روشنیوں سے بنا جسم!" کرامت حسین نے حیرانی سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

"اس طرح آپ کو وہ جسم نظر نہیں آئے گا۔" صفدر علی مسکرائے پھر بولے۔ "مگر یہ بات اب سائنسی طور پر بھی ثابت ہو چکی ہے کہ ہر جسم کے اوپر ایک اور روشنیوں کا جسم ہوتا ہے جسے سائنسی زبان میں AURA (اورا) اور عرفِ عام میں ہمزاد کہتے ہیں۔

"اوہ۔" کرامت حسین کے منہ سے نکلا۔

"یہ جسم یعنی اورا مختلف رنگوں کی روشنیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اس میں ہر رنگ کی روشنی ایک خاص مقدار میں موجود ہوتی ہے اگر کوئی ایک روشنی بھی مقدار میں کم یا زیادہ ہو جائے تو روشنیوں کا توازن بگڑ جاتا ہے اور پھر یا تو انسان کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے یا پھر اس قسم کے عجیب و غریب واقعات پیش آنے لگتے ہیں۔" صفدر علی نے بتایا۔

"اوہ ــ اور یہ روشنیوں میں کمی یا زیادتی کس طرح ہوتی ہے۔" کرامت حسین نے پوچھا۔

"ان روشنیوں کا تعلق ہمارے کھانے پینے سے ہے اگر کھانے میں توازن نہ رہے مثلاً مٹھاس بہت زیادہ کھائی جائے یا کم، نمکین چیزوں کا استعمال زیادہ یا کم ہو جائے تو بگاڑ پیدا ہوتا ہے یعنی مٹھاس، کھٹاس، نمکینیت کا تعلق براہِ راست ان روشنیوں سے ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح جسم میں غذائیت کے کسی جزو مثلاً پروٹین، وٹامن وغیرہ کی کمی یا زیادتی ہو تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔

"ہوں مگر یہ بات اب بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ اورا کے بیمار پڑنے سے یہ چڑیل وغیرہ کیوں نظر آنے لگتی ہے۔"

"بھئی دیکھیں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک شعور اور ایک لاشعور۔ جب ہم جاگتے ہیں تو شعور کام کرتا ہے لیکن جب سوتے ہیں تو شعور بھی سو جاتا ہے پھر لاشعور حرکت میں آ جاتا ہے اور وہ چیزیں جو ہمارے دماغ کے کسی خفیہ خانے میں چھپی ہوتی ہیں۔ لاشعور انہیں نکال کر خواب میں دکھاتا ہے اسی لئے کئی دفعہ خواب سچے بھی ہوتے ہیں۔ جب اورا میں گڑبڑ ہو جائے تو پھر بعض اوقات لاشعور ہمارے دماغ میں چھپی باتیں خواب کے علاوہ جاگتے میں بھی دکھانے لگ جاتا ہے یعنی لاشعور ضرورت سے زیادہ متحرک ہو جاتا ہے۔"

"یعنی آپ کا کہنا یہ ہے کہ وہ چڑیل ہمارے ذہن کی اختراع ہے جو لاشعور ہمیں دکھا رہا ہے؟"

"بالکل! جب آپ کے پہلے بچے کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا تو اگرچہ سب نے اسے وہم قرار دیا مگر یہ بات دماغ کے کسی گوشے میں رہ گئی کہ شاید یہ حقیقت ہو۔ اور اسی بات کو حقیقت بنا کر لاشعور آپ کی آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے۔ آپ جتنا اس بارے میں سوچیں گے اتنا ہی یہ منظر واضح ہوتا جائے گا۔ لہٰذا اب جب کبھی بھی ایسی کوئی صورت نظر آئے فوراً ذہن میں یہ دہرائیں کہ آپ کے سامنے کچھ نہیں یہ آپ کا وہم ہے بار بار یہ دہرائیں اور نمک کا استعمال کم سے کم کریں تاکہ اورا میں روشنیوں کا توازن درست ہو جائے۔

دو ہفتے بعد کرامت صاحب پھر صفدر علی کے کلینک میں موجود تھے۔

"کہئے کرامت صاحب! کیا حال ہے؟ چڑیلیں نظر آنا بند ہوئیں یا نہیں۔" صفدر علی نے مسکرا کر پوچھا۔

"اس دن کے بعد دوبارہ مجھے اور شرافت کو وہ چڑیل نما عورت رات کے وقت پھر نظر آئی تھی مگر ہم نے ذہنی طور پر خود کو یقین دلایا کہ یہاں کچھ نہیں پھر واقعی وہ نظر آنا بند ہو گئی اور گزشتہ ایک ہفتے سے تو ہم بالکل نارمل انداز میں رہ رہے ہیں۔ نمک کو تو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"گڈ..... اس کا مطلب ہے کہ آپ سب کے اورا یا ہمزاد میں روشنیوں کا توازن درست ہو گیا ہے اب آپ ذرا کم مقدار میں نمک استعمال کر سکتے ہیں۔ بس کسی چیز کی بھی زیادتی سے بچیں۔"

"فکر نہ کریں صاحب اب تو ہم اس جسم کے ساتھ ساتھ اس دوسرے روشنیوں کے جسم کا بھی خاص خیال رکھیں گے۔ اس کا بیمار پڑنا تو بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔" کرامت حسین نے کہا تو صفدر علی مسکرانے لگے۔

پھر کرامت حسین ان سے اجازت لے کر باہر نکل آئے۔ اور اپنی کار کی طرف بڑھے۔ وہ اچانک ٹھٹھک کر رک گئے۔ سڑک پر ایک عورت چلی جا رہی تھی جس کی پشت پر لمبے لمبے بال لہرا رہے تھے۔ انہیں فوراً چڑیل کا خیال آیا مگر انہوں نے لاحول پڑھی۔ لمبے بال دیکھتے ہی چڑیل آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ وہ سر کو احتیاط سے جھکائے ہوئے کار میں بیٹھ گئے کہ کہیں "اورا" باہر ہی نہ رہ جائے۔

کام کی باتیں

○ ..... دولت نرم و گرم بستر دے سکتی ہے مگر نیند نہیں۔

○ ..... دولت کتابیں دے سکتی ہے مگر علم نہیں۔

○ ..... لوگوں سے اس طرح ملو اگر مر جاؤ تو تمہیں یاد رکھیں۔

مرسلہ ..... محمد اختر سردار، کسووال

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابل اشاعت تحریریں ضائع کر دی جاتی ہیں۔ ایسی تحریروں کی واپسی کا مطالبہ نہ کریں۔ تحریر بھیجتے وقت اس کی ایک نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں..... (ادارہ)

"پیرا شوٹ" عبدالقدیر انڈھڑ، پنو عاقل۔ "علم" نوشین شیخ، نواب شاہ۔ "تقدیر ایک فن" فرقان وہاب، کراچی۔ "گداگری" یلیحہ اشرف اعوان، راولپنڈی۔ "جادوئی صندوق اور پریاں" عبدالعلیم، پشاور۔ "خونی چڑیل، آدم خور اور ذیشان" حکمت اللہ خان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "پچھتاوا" "غزل" کیڈٹ عرفان، احمد، پنارو۔ "موئے لڑکے کی روداد" انوار احمد آس، کراچی۔ "نیا عہد" سعدیہ جمیل احمد، نواب شاہ۔ "غریب لڑکا" سردار خان، کراچی۔ "پشت پر گولیاں کھانے والے" "قدم ملا کر چل" محمد مامون رشید، رحیم یار خان۔ "ایک خوفناک عجیب و غریب بستر" سید شہر بانو بخاری۔ "شیر اور انسان" اسلم خان آرائیں، حیدر آباد۔ "چوہے کی شرارت" سید صولت علی جعفری، حیدر آباد۔ "دعا" انمول گھڑی" "انمول گھڑی" اسما بدر، کراچی۔ "ایک افریقی شیر کی کہانی" محمد فاروق، لاہور کینٹ۔ "حمد" زاہد حسین زاہد، پسنی۔ "جیتی ہوئی ہار" ایاز حسین، کراچی۔ "بڑا بھائی" فرحین طاہر شمسی، کراچی۔ "اکثر ہوتا ہے یوں" عائشہ، خاتون، پشاور۔ "میری خواہش" (نظم) سارہ علوی، کراچی۔ "ایک دلچسپ شخصیت" نوید احمد مجید، کراچی۔ "تنہائیوں کا گھر قبر" انیلا ناز عمر، کراچی۔ "شرارتی بھائی" "امی کے دو چوزے" امین آکاش، اورنگی ٹاؤن۔ "گفٹ پیک" حارث مرزا (؟)۔ "ادیب" "آنکھ مچولی" ہرجیت سنگھ، مردان۔ "ہابیل" "اہمیت" عدیم منصور احمد کراچی۔ "آزادی کا دن" سعد علی خان، حیدر آباد۔ "قدرت کا انصاف" محمد ثاقب مختار، کراچی۔ "قلم" محمد فیصل امین، کراچی۔ "عمل اور رد عمل" عشرت راضیہ رضوی، ایبٹ آباد۔ "چند باتیں پرندوں جانوروں کی" قمرالعین پاشا، فیصل آباد۔ "سلیمان اور کالا دیو" محمد طارق، کراچی۔ "چھپا ہوا خزانہ" کراچی۔ "سانٹا" یاسمین بلی حنا، کنری۔ "ایک رات" محمد عمر درانی، لاہور۔ "افسوس ناک" عروج زہرہ، راولپنڈی۔ "اف یہ ہمارے پڑوسی" الطاف الرحمٰن رحمانی، بینگلورہ۔ "نمک حرام" عثمان عدیل، جہلم کینٹ۔ "حضرت ایوبؑ" رضوان اکرم، رحیم یار خان۔ "بے سر بے دم کا شیر" شعیب جاوید، (؟)۔ "ننھے شکاری" زہرہ بتول، لاہور۔ "صحت کے اصول" ھما شریف، کراچی۔ "جادو کی چھپکلیاں" پراسرار بھکاری" اسما بدر، کراچی۔ "بلا عنوان" "آنکھ مچولی" ہارون اقبال، میرپور خاص۔ "احساس" سارہ مصطفیٰ، کراچی۔ "کاش یہ سچ ہوتا" شہلا ناز، کراچی۔ "قیمتی فراک" سمیرا رحمٰن، آزاد کشمیر۔ "کوئٹہ میں چھ دن" نعیم الحق، کراچی۔ "ننھے سپرمین" "خواب" عرفان محمد حسین ـــ لیاری، کراچی۔ "نظم" سید اصغر عباس تخیل، شیخوپورہ۔ "ماحولیاتی آلودگی" اسعد علی خان، حیدر آباد۔ "اسکول کی ڈائری سے" قیصر حمید مجم، جھنگ صدر۔ "اداس بچہ" ملک اسد، پشاور۔ "ہیروں والی لڑکی" ملک نوید حیدر، راولپنڈی کینٹ۔ "چالاک چڑیل اور عقلمند بیوی" آسیہ بشیر لاہور۔ "جنت ارضی (نظم)" "دعا" (نظم) عدیل محمد خان، حیدر آباد۔ "بہادر لڑکا" فیصل عمران، گجرات۔

مس تو میں ہوں

شازیہ فرحین

شمّی آپی جب سے آٹھویں جماعت میں آئی تھیں ان کا دماغ آسمان سے باتیں کرنے لگا تھا۔ محترمہ اب اپنے آپ کو خاصی بڑی سمجھنے لگی تھیں۔ اور بچوں کے ساتھ کھیلنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ گھر کے سارے بچے جو ان کے ساتھ مل کر ایک اودھم مچائے رکھتے تھے، اب کھیلوں میں ان کے شرکت نہ کرنے سے سخت افسردہ تھے۔

اس وقت بھی وہ سنگھار میز کے آگے کھڑی کافی دیر سے اپنے بال سنوار رہی تھیں اور بچے انہیں دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے۔

"اللہ کرے انہیں تو چشمہ لگ جائے۔" سعدیہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

"میں تو کہتا ہوں لاٹھی ٹیکے بوڑھیوں کی طرح پھرتی رہیں۔" فیصل نے بھی لقمہ دیا۔

"کاش ان کے سارے بال رات ہی رات سفید ہو جائیں۔" گڑیا نے اپنے فراک کی جھالر کو موڑتے ہوئے ان کی طرف ایک دفعہ پھر کن اکھیوں سے دیکھا کچھ دیر تک وہ سب یونہی جلتے

کڑھتے کھڑے رہے اور پھر آخری کوشش کے طور پر ان کے پاس چلے آئے۔

"شنی آپی آخر آپ کو کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ نہ کھیلیں، پہلے تو آپ ایسی نہ تھیں ـــــ۔" فیصل نے بڑے خلوص سے شکایت کی۔

"بھئی میرا دل نہیں چاہتا، جاؤ تم لوگ اپنا کام کرو، میرا دماغ کھانے کیوں آگئے!" شنی آپی نے بڑی بے رخی سے کہا اور اپنے بال سنوارنے میں یوں مشغول ہوگئیں جیسے یہی دنیا کا اہم ترین کام ہے۔

ان کے اس رویئے پر سب ہی بچوں نے افسوس کا اظہار کیا۔ ان کے بغیر کسی کھیل میں مزہ بھی تو نہیں آتا تھا۔ کھیل کی ساری رونق ان ہی کے دم سے تھی۔ گڑیا کی شادی کرنا ہو تو وہ ہی نت نئے کپڑے سیتیں، گانوں کے پروگراموں کے منصوبے بناتیں، فیصل کے گڈے کی سالگرہ میں بھی انہوں نے ہی کیک بنایا تھا کچھ عرصہ پہلے "نیلام گھر" بھی انہوں نے اس دھوم دھڑکے سے کیا تھا کہ سارے محلے کے بچے ان کی واہ واہ کرتے نہ تھکتے تھے۔ غرض کہ محفل میلاد ہو یا چودہ اگست، اسکول کا کھیل ہو یا کوئی تماشا یہ سب کچھ شنی آپی کے ہی دم سے کامیاب تھا۔

شنی آپی کی شرارتیں بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ کبھی دادی اماں کا چشمہ لگا کر خود دادی اماں کا روپ دھار لیتیں اور بچوں پر یوں رعب جماتیں جیسے سچ مچ کی دادی اماں ہوں۔ بچوں کو ان کا رعب بھی خوب بھاتا کیونکہ تقریباً سب ہی ان کے دلدادہ تھے۔ پچھلے ہی ہفتے اسکول کے کھیل میں انہوں نے محلے بھر کے بچوں کو جمع کر کے ایک سچ مچ کا اسکول بنا ڈالا تھا اور خود ناک پر چشمہ سجائے، امی کی ساڑھی پہنے ہاتھ میں بڑا سا رجسٹر لئے اتراتی پھر رہی تھیں گڈو کو انہوں نے چپراسی بنایا تھا سلمان کو کلرک اور باقی سارے بچے طالب علم۔ بلیک بورڈ کے لئے انہوں نے پرانے تختے پر کالا رنگ کر کے کھونٹی سے ٹانگ دیا تھا اور طالب علموں سے ایسے مزاحیہ سوال پوچھے تھے کہ سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے تھے۔ مثلاً گڑیا سے انہوں نے پوچھا۔

"پرنسپل کی شکل ہیبت ناک کیوں ہوتی ہے؟" جواب میں گڑیا صاحبہ ہونقوں کی طرح منہ بنائے ادھر ادھر دیکھتی رہیں پھر جواب بھی خود انہوں نے ہی دیا۔

"اس لئے کہ انہیں مسکرانا نہیں آتا۔"

سب ہنس پڑے لیکن اب شنی آپا سنجیدہ ہوئیں تو ساری رونق ایک دم ختم ہوئی۔

سعدیہ نے ان کے اس رویئے پر امی سے بھی شکایت کی مگر امی نے تو گویا اس معاملے میں دلچسپی کا اظہار ہی نہیں کیا۔ بھیا بھی ہنس کر چپ ہو رہے اور پھر جب کوئی شنوائی نہ ہوئی تو ان سب نے احتجاجاً شنی آپی سے بات چیت ہی بند کر دی۔

"اس دن بھی جب تایا جان کی فیملی آئی تو

محترمہ بڑوں میں سر گھسائے بیٹھ گئیں۔ کافی دیر تک جب وہ امی کا اشارہ نہ سمجھ سکیں اور مسکراتی ہوئی بیٹھی رہیں تب امی نے باہر بلا کر انہیں خوب ڈانٹا۔

"بچے بچوں میں بیٹھتے ہیں یہ بڑوں میں بیٹھنے کی تمہیں کیا سوجھی ہے۔" امی کی ڈانٹ سن کر ان کی دھیمی سی آواز ابھری۔

"امی اب تو میں بڑی ہو گئی ہوں آٹھویں جماعت میں آگئی ہوں نا۔۔۔۔" شنی آپی نے بے ساختہ کہا جواباً امی مسکرائیں اور پھر ڈرائنگ روم میں چل دیں فیصل جو دور کھڑا ان کی سبکی ہوتا دیکھ رہا تھا جلدی سے ان کے قریب آیا اور ان کے کان کے قریب اپنا منہ لا کر ان کے لہجے کی نقل اتاری: "امی اب تو میں بڑی ہو گئی ہوں، نویں جماعت کی طالبہ ہوں نا۔۔۔۔" شنی آپی اس کے پیچھے دوڑیں۔

پھر اس دن سلیم بھائی کے دوست نے بھی جب ڈرائنگ روم سے اسے آواز دے کر کہا: گڑیا ذرا پانی لانا تو وہ پیر پٹختی ہوئے بولیں۔

"آصف بھائی اب تو میں آٹھویں جماعت میں آگئی ہوں مجھے گڑیا تو نہ کہیں۔"

"بھئی تم تو ابھی بھی ننھی منی گڑیا ہو۔" آصف بھائی نے بے پروائی سے کہا اور فٹافٹ پانی پینے لگے شنی آپی کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ پانی کا پورا گلاس ان پر دے ماریں آج ان کی بے حد سبکی ہوئی تھی اسی لئے وہ دن بھر اداس رہیں۔ البتہ رات کو جب صائمہ آپی باورچی خانے میں گھسیں تو شنی نے علی الاعلان کہہ دیا کہ آج وہ سالن بنائیں گی۔

"اور جو ہاتھ جلا لیا پھر۔۔۔۔!!" صائمہ آپی نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"کمال کرتی ہیں آپ بھی، آخر اب میں آٹھویں جماعت میں آگئی ہوں" شنی آپی جھنجھلائیں اور پھر جو صائمہ آپی کے قہقہے فضا میں بلند ہوئے..... اللہ کی پناہ۔

"آپ بہت بری ہیں" شنی آپی نے کہا اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئیں برابر والے کمرے سے بھیا کے گانا گانے کی آواز انہیں مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھی۔

میرے بچپن کے دن کتنے اچھے تھے دن
آج بیٹھے بٹھائے کیوں یاد آگئے

کچھ دیر تک تو بھیا کے گانے پر جھنجھلاتی رہیں مگر جب ان کی پر سوز آواز بند نہ ہوئی تو انہوں نے گانے کے مفہوم پر غور شروع کر دیا۔

"ہائے یہ بچپن اب کوئی اتنی اچھی چیز بھی نہیں ہے۔۔۔۔" شنی آپی نے جھنجھلاتے ہوئے سوچا اور بھیا کے پاس چلی آئیں۔

"بھیا آپ ہمیشہ یہی گانا کیوں گاتے رہتے ہیں ..... کچھ اور بھی تو گایا کریں۔" شنی آپی نے کہا۔

"بھئی یہ گانا گا کر ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنے بچپن میں پہنچ گیا ہوں..... ہائے میں بھی کیسی کیسی شرارتیں کیا کرتا تھا، کبھی رامو کی گدھا گاڑی پر بیٹھ جاتا تو کبھی جھوٹ موٹ کا اسٹور کھول کر اپنے پرانے

کھلونے بیچتا ..... بھئی میں نے تو اپنے بچپن کو بہت ہی انجوائے کیا ہے ....."

"تو کیا آپ کو اب مزہ نہیں آتا؟" شنی آپی نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل نہیں بچپن تو ایسی حسین چیز ہے کہ اس کا کوئی بدل ہی نہیں ....."

"اچھا!" شنی آپی نے حیرانی میں ڈوبتے ہوئے کہا اور پھر بھیا کی باتیں غور سے سننے لگیں۔

"بھیا پھر آپ نے کس کلاس میں آکر یہ سارے کھیل کود چھوڑے؟" شنی آپی کا سوال تجسس سے بھرپور تھا۔

"یہی کوئی اسکول سے نکلنے کے بعد"، بھیا نے کہا تو انہوں نے انگلیوں پر گننا شروع کر دیا۔ "اوہ! ابھی دو سال مجھے مزید اس دنیا میں رہنا ہے۔"

شنی آپی نے سوچا اور پھر دن بھر کے واقعات ان کی نظروں کے سامنے لہرا گئے۔

"کیا واقعی وہ غلطی پر ہیں؟" انہوں نے ایک نئے رخ سے سوچا اور پھر سوچتی ہی رہ گئیں۔

"واقعی بڑوں کی دنیا تو ایسی ہی تھی۔ بس باتیں، کام بحث مباحثے امی کی دیکھو تو وہ دن بھر کاموں میں مصروف رہتیں، ابو بھی آفس سے آنے کے بعد اخبار پڑھتے رہتے، دادی اماں بھی اپنی بیماریوں کے ساتھ پلنگ پر پڑی رہتیں صائمہ آپی کو باورچی خانے سے فرصت نہ تھی جبکہ بھائیوں کو تو سوائے ڈانٹ ڈپٹ سننے کے کوئی کام ہی نہیں تھا لیکن بچوں کی دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ کھیل، کود، عیش، آرام، رنگینی، دلچسپی، شرارتیں ..... کیا کچھ نہیں اور پھر بھیا تو کہہ رہے تھے کہ بچپن لوٹ کر پھر کبھی نہیں آتا۔" شنی آپی یہ سوچتے ہوئے ایک دھماکے کے ساتھ اٹھیں اور بچوں کے کمرے کی طرف چل دیں۔

"میں آسکتی ہوں!"، ان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"آجائیے!" سعدیہ نے روکھے پن سے کہا۔

"کیا کھیل رہے ہوں؟" شنی آپی کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔

"کچھ بھی کھیلیں! آپ کو کیا؟" فیصل نے بھناتے ہوئے کہا اور وہ سب اپنے کھیل میں مشغول ہو گئے اسی لمحے گڑیا شنی آپی کی طرح امی کی ساڑھی باندھے، چشمہ لگائے مس بن کر کھڑی ہو گئی۔

"چلو سب بیٹھ جاؤ اور کاپیاں نکالو" گڑیا کی رعب دار آواز گونجی۔ اسی لمحے شنی آپی بے ساختہ ہی تیزی سے اٹھیں اور بلند آواز سے بولیں "مگر مس تو میں ہوں!"

"کک کک ..... کیا!!!" سب بچوں نے حیرت سے چیختے ہوئے انہیں دیکھا ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ سے گئے تھے اور وہ بیچارگی سے سب کو دیکھ رہیں تھیں اور سارے بچے ان کی واپسی پر منہ پر ہاتھ رکھے ہنستے جا رہے تھے .....!!

اب تو ہم بھی کھائیں گے

احمد

فریش ویلہ

مٹھائیاں اب مارجرین میں بنی ہیں

روایت ٹوٹے مٹھائی نہ چھوٹے

مارجرین سے تیار کردہ مٹھائیاں
کولیسٹرول سے پاک
چکنائی سے بے نیاز
طبیعت گرانی سے دُور

فریش ویلہ آج کے دور میں صحت کے نئے تقاضوں کے مُطابق

نقشے طرح طرح کے

عباس عالم

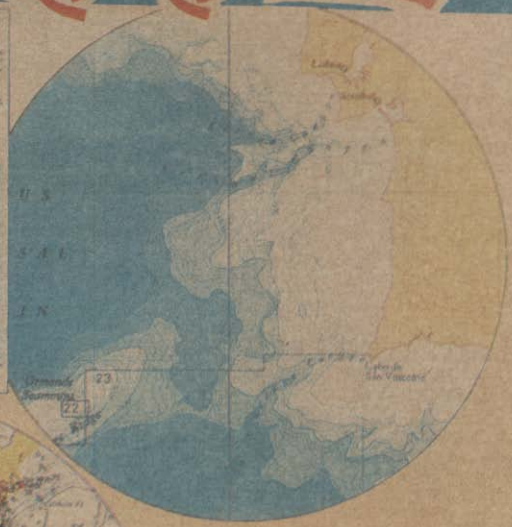

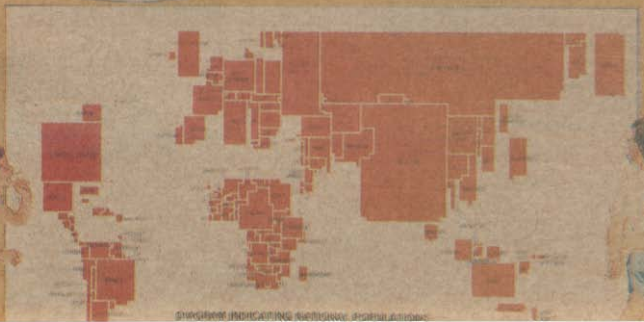

"اسٹیشن کون سا رستہ جاتا ہے جناب؟" بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے طالب علم نے ایک صاحب سے پوچھا۔ "اسٹیشن!" وہ صاحب سوچنے لگے۔ "بیٹا یوں بتانا تو مشکل ہے۔ تمہارے پاس کاغذ قلم ہے!"

"جی ہاں!" طالب علم نے فوراً انہیں کاغذ قلم تھما دیا۔

"دیکھو اس طرح۔" انہوں نے کاغذ پر چند لکیریں کھینچیں۔ "یہاں سے دائیں جانب۔ اور پھر اس طرف۔" انہوں نے ایک اور لکیر کھینچی۔ "یہاں ایک ہسپتال ہے۔" انہوں نے چوخانہ سا بنایا۔ "اور یہ اس کے بالکل سامنے اسٹیشن ہے۔" انہوں نے بات مکمل کی۔

"بہت بہت شکریہ جناب!" طالب علم کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی منزل کی طرف چل دیا۔ دیکھا آپ نے! یہ ہے نقشے کا کمال جس سے آپ خوب واقف ہیں۔

انسان نے آج سے بہت پہلے نقشے کا یہ استعمال سیکھ لیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ باقی چیزوں کی طرح نقشہ بنانے کے فن نے بھی کافی ترقی کی اور آج کل تو نقشہ، جیسے ہماری زندگی کی ضروریات میں شامل ہو گیا ہے۔ اخبارات سے ٹیلی ویژن تک سب نقشوں کے ذریعے مختلف باتیں سمجھاتے نظر آتے ہیں۔ وقت بدلتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک ٹوٹتے اور بنتے رہتے ہیں۔ سرحدیں بدلتی رہتی ہیں اور ان کے ساتھ نقشے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

ابھی کوئی چار سال پہلے جب سوویت یونین ٹوٹا تو ساری دنیا کے نقشے بے کار ہو گئے۔ جلدی جلدی پوری دنیا کے نقشے دوبارہ سے بنائے گئے۔ اصل میں یہ نقشے بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔

اٹلس نقشے:۔ اٹلس آپ نے گھر میں یا پھر اسکول کالج میں دیکھی ہوگی۔ یہ نقشے اصل میں انسانوں کے نہیں بلکہ زمین کے بارے میں ہوتے ہیں۔ کہاں پہاڑ ہے کہاں سمندر ہے؟ زمین کی شکل کہاں پر کیسی ہے؟ اونچی ہے یا نیچی۔ چٹانیں ہیں یا دریا۔ یہ سب اٹلس میں دکھایا جاتا ہے اور اس کے لئے طرح طرح کے رنگ اور نشانات استعمال ہوتے ہیں۔

ٹوپو گرافک نقشے:۔ ابھی ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ اٹلس انسانوں کے نہیں بلکہ زمین کے بارے میں آپ کو بتاتی ہے۔ ٹوپو گرافک نقشوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہ آپ کو انسانوں کے بارے میں بتاتے ہیں یعنی یہ کہ کہاں پر کتنی آبادی ہے۔ کس کس طرح کے لوگ رہتے ہیں؟ یہ نقشے سیاحوں یا گھومنے پھرنے والے لوگوں کے بہت کام آتے ہیں ان میں بنے ہوئے نشانات سے یہ لوگ مزے سے سمجھ لیتے ہیں کہ اب انہیں کس طرف جانا ہے کہاں انسان رہتے ہیں اور کہاں ویرانہ ہے۔

تھیمیٹک نقشے:۔ ان نقشوں میں کوئی خاص بات بنائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ کس جگہ کا

میلی خلا

۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کے روز پہلا مصنوعی سیارہ خلا میں چھوڑا گیا تھا۔ یہ روس کا سیارہ "سپٹنک" تھا اس کے بعد اب تک ساڑھے تین ہزار مصنوعی سیارے، خلائی جہاز راکٹ وغیرہ خلا میں بھیجے جا چکے ہیں جون ۱۹۸۶ء کے ایک سروے میں انکشاف ہوا ہے کہ ایک ہزار چھ سو نیس سیارے وغیرہ خلا میں اڑ رہے ہیں اور ایک ہزار آٹھ سو چھتر خلا میں ہی تباہ ہو چکے ہیں ان کے مختلف پرزے اور ٹکڑے جو نئے مصنوعی سیاروں میں استعمال ہو سکتے تھے۔ زمین کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ ان کی تعداد ۴۴۵۷۰ بتائی جاتی ہے اس طرح انسان نے خلا میں بھی کوڑا کباڑ بکھیر دیا ہے۔

مرسلہ:۔ عبدالستار خان طاہر، بورے والا۔

موسم کیسا ہے یا پھر یہ کہ کس جگہ کی آبادی کس طرح کی ہے۔ کبھی کبھی ہم اخباروں میں دیکھتے ہیں کہ کوئی قتل کی واردات کس طرح ہوئی یا ڈاکوؤں نے کیسے کوئی بینک لوٹ لیا اس کے لئے بھی نقشہ بنا دیا جاتا ہے۔ یہ اس طرح کے نقشے ہوتے ہیں۔

سائنسی نقشے:۔ کچھ نقشے سائنسی اطلاعات فراہم کرنے کے کام بھی آتے ہیں۔ ان میں خاص طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ کہاں کی زمین کیسی ہے؟ کہیں زمین بہت سخت ہوتی ہے کہیں بہت نرم۔ کہیں دلدل اور کہیں ریتیلی۔ یہ ساری معلومات ان نقشوں میں مختلف رنگوں اور علامتوں کے ذریعے دی گئی ہوتی ہیں۔ پھر جب کوئی پل تعمیر کرنا ہو یا عمارت بنانی ہو تو ماہرین ان نقشوں کی مدد سے فیصلہ کرتے ہیں کہ کہاں پر کیا چیز تعمیر کی جا سکتی ہے۔

نقشے پڑھنا:۔ نقشے بنانے کے فن نے اب اتنی ترقی کر لی ہے کہ نقشے پڑھنا بھی ایک فن ہو گیا ہے۔ اب جو نقشے بنائے جاتے ہیں ان کا پڑھا جانا بھی خاصا مشکل ہوتا ہے۔ آپ کو پتہ ہونا چاہئے کہ کن رنگوں کا کیا مطلب ہے؟ کن علامات سے کیا مراد لی گئی ہے تاکہ آپ نقشوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ نقشوں میں فاصلہ بتانے کے لئے خاص پیمانے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایک انچ کا مطلب ایک میل بھی ہو سکتا ہے اور ایک سو میل بھی۔ اس کی وضاحت بھی نقشے میں کی گئی ہوتی ہے۔ اگر یہ سب باتیں سمجھ میں نہ آ رہی ہوں تو نقشوں کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

نقشے اور کمپیوٹر:۔ کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد نقشے بنانے کے فن نے ذرا اور ترقی کی۔ کمپیوٹر کے ذریعے بہت سی وہ باتیں بھی نقشے میں شامل کی جانے لگیں۔ جن کے بارے میں پہلے خیال تھا کہ ان کو نقشے کے ذریعے سجایا نہیں جا سکتا۔ نئی نئی علامتیں استعمال ہونے لگیں۔ جنہیں ماہرین ہی سمجھ سکتے ہیں یہ ماہر آپ بھی ہو سکتے ہیں لیکن اگر آپ اتنے ماہر نہ بھی ہوں تو بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔ کسی طالب علم کو اسٹیشن جانے کا راستہ تو آپ تب بھی سمجھا سکتے ہیں۔ چند لکیریں بنا کر۔ بڑی آسانی سے۔ یہی نقشے کا فائدہ ہے۔

کراچی خون میں ڈوبا ہوا ہے

عبدالقادر

کراچی خون میں ڈوبا ہوا ہے
جسے بھی دیکھئے سہما ہوا ہے

کلاشن کوف کی ہے حکم رانی
لہو انسان کا ہے جیسے پانی

یہاں قانون جنگل کا ہے جاری
بنا انسان، انساں کا شکاری

شکاری دندناتے پھر رہے ہیں
یہاں بندوں کے لاشے گر رہے ہیں

یہ کیا اندھیر ہے اس سر زمیں پر
ہے کیسا داغ انساں کی جبیں پر!

یہاں پڑتے ہیں ڈاکے دن دہاڑے
شکم انسان کا، انسان پھاڑے

ڈکیتی کی یہ ہر سُو وارداتیں
یہی ہیں کیا جواں مردی کی باتیں؟

نظام اس شہر کا بگڑا ہوا ہے
خدا کے قہر میں جکڑا ہوا ہے

سمندر آب کا شرما رہا ہے
مقابل خون کو جب پا رہا ہے

گلا انسان کا انساں نے کاٹا
یہی ہے راستہ جس میں ہے گھاٹا

ضمیرِ آدمی جب سو گیا ہے
جُدا بھائی سے بھائی ہو گیا ہے

یہ دریا خون کا کس نے بہایا؟
لہو رب کی زمیں پر کیوں گرایا؟

نبیؐ کے نام کا پڑھتے ہو کلمہ
نبیؐ کو خود ہی پہنچاتے ہو صدمہ

نہیں ہے یہ جہادِ کفر و ایماں
مُسلمانوں کے قاتل ہیں مُسلماں

بہائے جا رہے ہیں خونِ انساں
مٹاتے آپ ہیں نسلِ مُسلماں

خدا فریاد سُنتا ہے ہمیشہ
وہی انصاف کرتا ہے ہمیشہ

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوں کے جواب

عبدالروف روفی، علی رشید، ملتان کینٹ۔ دسمبر کا آنکھ مچولی پڑھا۔ رسالہ ہمیشہ کی طرح رنگین تھا۔ نظمیں سب اچھی تھیں۔ لطائف مزے دار تھے کہانیاں سب پسند آئیں لیکن "وہ کیا راز تھا" نہ پاکر بہت افسوس ہوا۔ جمیل بشیر، حیدر آباد۔ دسمبر کا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ "سالگرہ" "بدلہ" "مومن کا رومال" "رانگ نمبر" اور "وہ کیا دن تھے" بہت پسند آئی۔ ارسلا مغل مون (؟)۔ تازہ شمارے میں "بوڑھی زمین" "رانگ نمبر" اور "مومن کا رومال" اچھی تحریریں تھیں۔ ہما شریف، کراچی۔ ایک چاند سرورق میں نظر آرہا ہے دوسرا عبدالقادر صاحب کی نظم نے لگادیا ہے۔ آپ عبدالقادر صاحب کا انٹرویو شائع کریں۔ محمد سعید گلاب، کراچی۔ دسمبر کے آنکھ مچولی میں ویسے تو تمام ہی کہانیاں اچھی تھیں لیکن محمد عادل منہاج کی کہانی "ریڈالی کی آمد" سب سے زیادہ پسند آئی۔ عادل آنکھ مچولی کے لئے ناول لکھیں نا! عظمیٰ نسیم، بہاول نگر۔ شمارہ معلوماتی مضامین سے مزین تھا۔ خطوط کا کالم آنکھ مچولی کی جان ہے۔ رضوان ظہیر، بینش (؟)۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ "آمنے سامنے" میں اپنا نام پاکر بے حد خوشی ہوئی۔ خرم شکیب، لاہور۔ "میں غلطی پر تھا" "بدلہ" "سالگرہ" "مومن کا رومال" جیسی کہانیاں پسند آئیں۔ عزیز عبداللہ صدیقی، کراچی۔ دسمبر کے شمارے میں عائشہ قریشی کی کہانی "سب سے طاقتور" نقل شدہ تھی۔ یہ نونہال میں چھپ چکی ہے۔ ○ ..... بطور ثبوت اس کا تراشہ بھیج دیجئے تاکہ مصنفہ کو بلیک باکس کیا جاسکے۔ نثار احمد ہاشانی بلوچ، دادو۔ ہم آپ سے کہاں مل سکتے ہیں؟ ○ ..... ارے! مل تو رہے ہیں..... بنام آنکھ مچولی میں۔ فرح عزیز،

ایک خط ایک مسئلہ

جناب مدیر اعزازی

سلام کے بعد آپ کی توجہ پاکستان کے ان بچوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو تباہی کے راستے پر چل رہے ہیں۔ قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ ہمارے نوجوان مستقبل کے معمار ہیں لیکن ہمارے نوجوان سگریٹ نوشی کا شکار ہیں۔ بارہ بارہ سال تک کے بچے سگریٹ پی رہے ہیں۔

سگریٹ سے ٹی بی کھانسی اور گلے کا کینسر جیسی خطرناک بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ اس مہلک شے سے بچنا چاہئے کہ سگریٹ نوشی سے صحت کا سراسر نقصان ہے۔

کیا تمام ابو اور تمام بھائی سگریٹ نوشی چھوڑ کر ایک نسل کو سگریٹ کی تباہ کاریوں سے بچائیں گے؟؟

عمر عالم خان، کراچی۔

عروج عزیز، کراچی۔ آنکھ مچولی ہمیں وقت پر مل جاتا ہے۔ دسمبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ اتنا حسین رسالہ شائع کرنا آپ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ **عطاء اللہ نذیر، فیصل آباد۔** آنکھ مچولی کا سرورق عمدہ اور کہانیاں بہترین ہوتی ہیں۔ آپ کا رسالہ بازار میں کب تک آجاتا ہے؟ ○ ..... ہر مہینے کی پہلی تاریخ سے پہلے آنکھ مچولی بازار میں دستیاب ہوتا ہے۔ **اعجاز عباس، آمنہ، کراچی۔** ہمیں آنکھ مچولی کا شدت سے انتظار رہتا ہے اس بار "میں غلطی پر تھا" اور "عینی کو ممی کا انتظار ہے" اچھی کہانیاں تھیں۔ **عارف حسین، سکھر۔** دسمبر کا شمارہ دھڑکتے دل کے ساتھ کھولا۔ کہانیاں اور مضامین دلچسپ تھے۔ **ساجد انور، کراچی۔** تازہ شمارہ جلد مل گیا۔ سب کہانیاں پسند آئیں۔ **عبدالستار خان، طاہر، بوریوالہ۔** محمد عادل منہاج کی کہانی اور منیر احمد کی کہانی عالم اسلام اور پاکستان کے حوالے سے تھی ہم نے سقوط ڈھاکہ کو بھلا دیا تو آج سقوط سندھ، سقوط کراچی اور سقوط سرحد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اے اللہ! ہمیں ایسے دن نہ دکھانا۔ آپ نے میرے مضمون "قائداعظم کی طلبہ سے محبت" میں ناگپور کے ایک گراؤنڈ کا نام غلط لکھ دیا ہے اس کا صحیح نام ہے "گاف گراؤنڈ۔" تصحیح فرما لیجئے۔ ○ ..... توجہ دلانے کا بے حد شکریہ! **آصف اقبال، کراچی۔** اس بار کہانیاں بہت اچھی تھیں لیکن مضامین بور تھے سوائے ایک مضمون کے اور وہ تھا "اللہ اکبر"۔ لطائف آپ نے کیسے چھاپ دیئے کارمینا کی گولیاں رکھنی پڑیں۔ اس بار آنکھ مچولی میں "لوٹ پیچھے کی طرف" اور "میرا نام کلاشن ہے" ملک میں ہونے والی دہشت گردی اور ٹی وی پر پیش کئے جانے والے ناچ گانوں کے خلاف لکھے گئے جو اچھے لگے۔ **جویریہ تھانوی، (؟)** دسمبر کے شمارے میں ایک چڑیا کی شادی تھی" "وہ کیا دن تھے" "صبح کے تحفے" "سردی کی ہے بات نرالی" اور "تتلی" بے حد پسند آئیں۔ **محمد تنویر شیراز، چکوال۔** سرورق بہت ہی عمدہ تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ "مائیکل فیراڈے" پر جو مضمون دسمبر میں شائع ہوا اس کا ایک جملہ یوں تھا۔ "یہ ایک لوہار کا بیٹھا تھا۔" غلطی درست کر لیجئے۔ ○ ..... "یہ ایک لوہار کا بیٹا تھا۔" لیجئے غلطی درست ہو گئی۔ توجہ دلانے کا بے حد شکریہ۔ **عبدالحفیظ ساجد، پسنی۔ (بلوچستان)۔** سندھ میں جسے باب الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے، اس میں دہشت گردوں نے دہشت مچائی ہوئی ہے کسی کو سکھ چین نصیب نہیں۔ روزانہ

بے گناہ انسان مارے جارہے ہیں۔ آج مسلمان، اپنے مسلمان بھائی کے گلے پر چھری پھیر رہا ہے..... رنگ کی خاطر، نسل کی خاطر، صوبے کی خاطر، بولی کی خاطر آخر کس کی خاطر؟ کیا ہمیں بابائے قوم کے وہ الفاظ یاد نہیں کہ " پاکستان بلوچوں کا نہیں، پٹھانوں کا نہیں، سندھیوں کا نہیں، مہاجروں کا نہیں، پنجابیوں کا نہیں بلکہ یہ ملک صرف پاکستانیوں کا ہے۔ " ہم اگر پاکستانی نہیں بن سکتے تو مسلمان ہی بن جائیں اور انسانیت کا احترام کرنا سیکھیں! عامرہ، عامر، حنا، ایبٹ آباد۔ تحریریں بے حد خوبصورت اور دلچسپ تھیں۔ اسلامی مضمون " حق کی تلاش میں " نے بہت متاثر کیا۔ کہانیوں میں " بے بس مسیحا " " رانگ نمبر " اور " سالگرہ " لاجواب تحریریں تھیں۔ " ریڈ الی کی آمد کچھ زیادہ متاثر کن نہ تھی۔ " رحمان بابا " " نپولین ایک عظیم جرنیل " اچھے مضامین تھے لیکن اس مرتبہ پرنٹنگ کا معیار کچھ بہتر نہ تھا پھر سلسلہ وار کہانی " وہ کیا راز تھا " بھی غائب رہی۔ انکل! خاص نمبر اب کب نکالیں گے؟ ○..... انشاء اللہ وقت آنے پر۔ عدیل احمد، مدثر احمد، کراچی۔ دسمبر کا آنکھ مچولی اچھا تھا، لطائف بھی پسند آئے۔ محمد حسنین، ہارون ڈیرہ غازی خان۔ " سنہرے حروف " ہمیشہ کی طرح سنہرے تھے۔ " ماہِ رواں کی پہلی بات " میں قلم کے ذریعے اچھے الفاظ بکھیرے گئے۔ کہانیاں مضامین اچھے تھے۔ قلم دوست کی تحریریں پسند آئیں اس بار سلسلہ وار کہانی " وہ کیا راز تھا " کی بارہویں قسط نہ پا کر افسوس ہوا۔ رضوانہ کنول، کراچی۔ سرورق پسند نہیں آیا۔ اس بار کہانیاں سب اچھی تھیں لیکن قلم دوست کی تحریریں لاجواب تھیں۔ رسالے کی چھپائی اچھی نہیں تھی سب سے زیادہ دکھ اس بات سے ہوا کہ ہماری پسندیدہ کہانی " وہ کیا راز تھا " رسالے میں موجود نہ تھی۔ ○..... پچھلے شمارے میں چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس کی بارہویں قسط شائع نہ ہو سکی۔ اس بار یہ کہانی حاضر ہے آپ کو انتظار کی جو زحمت اٹھانی پڑی اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

محمد عظیم قریشی، کراچی۔ شمارہ ملا، سرورق بہت خوب صورت تھا۔ مومن رحیم صاحب نے واقعی اپنے فن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ○..... بھئی! یہ سرورق تو ہمارے ایک اور آرٹسٹ عالی جمال صاحب نے بنایا ہے۔ شمع میر، میر پور خاص۔ آپ کی بھیجی ہوئی پرائز آف پوزیشن کی سند مل گئی۔ بہت مہربانی۔ ○..... یہ تو آپ کا حق تھا..... اس میں مہربانی کی کوئی بات نہیں۔ عرومہ یونس، اسلام آباد۔ سرورق دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا محمد عادل منہاج کی کہانی ہمیشہ کی طرح دلچسپ تھی۔ باقی کہانیاں بھی بہتر تھیں۔ ساجد صبا باغبازاری، پسنی۔ میرے امتحان ہونے والے ہیں میری کامیابی کے لئے دعا کیجئے۔ ○..... ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں آپ نے محنت کی تو انشاء اللہ کامیاب و کامران ہوں گے۔ عارفہ شارق، کراچی۔ آنکھ مچولی میں اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا تو خیال تھا آپ صرف اپنے رشتہ داروں کا خط ہی چھاپتے ہیں۔ ○..... آپ کا خیال بالکل درست ہے کیونکہ تمام بچے ہمارے رشتہ دار ہی تو ہیں۔ وجاہت اللہ، فراز اللہ، کراچی۔ آنکھ مچولی میں پہلی مرتبہ خط لکھ رہے ہیں امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ صائمہ محمود، کراچی۔ سرورق اچھا تھا۔ بہت مزا آیا۔ سید نوید احمد، کراچی۔ آپ بہت ساری تحریریں ضائع کر دیتے ہیں، وعدہ خلاف ہیں اور جھوٹے بھی۔ ○..... بھائی نوید! جب کسی ساتھی کی کوئی تحریر شائع نہ ہو تو پھر وہ اسی طرح کے خطوط لکھتا ہے۔ آپ کی ایک تحریر اصلاح کے بعد اس شمارے میں شامل ہے۔ عثمان تنویر ملک، لاہور۔ شمارہ پڑھا دل باغ باغ ہو گیا سبھی کہانیاں اچھی لگیں۔

Goldfish
Deluxe Pencil

حقیر سی لکیر

حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی

گولڈ فِش ڈیلیکس پینسل

SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 296001-4

جہاں چلے، رواں چلے

آمنے سامنے

اسٹار کھلاڑیوں سے سوال جواب کا دلچسپ سلسلہ

سلیم خالق

گزشتہ مہینے آسٹریلین کرکٹ ٹیم کے کچھ کھلاڑیوں کے جوابات شائع کئے تھے۔ وعدے کے مطابق بقیہ کھلاڑیوں کے جوابات حاضر ہیں، آئندہ ماہ جنوبی افریقہ کی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں کے جوابات شائع کئے جائیں گے۔

اسیٹو واہ

س..... اسیٹو واہ آپ نے اور آپ کے بھائی مارک واہ نے کرکٹ کی تاریخ میں شاندار نام پیدا کیا ہے۔ کیا آپ کے وہم و گمان میں یہ بات تھی کہ آپ دونوں بھائی ایک ساتھ ٹیسٹ ٹیم میں شامل ہوں گے اور اچھی کارکردگی دکھا کر ٹیم کے مستقل ممبر بن جائیں گے؟ (شاہد علی، بورے والا)

اسیٹو واہ..... بچپن ہی سے ہم دونوں ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے کا خواب دیکھا کرتے تھے پھر میں ٹیم میں شامل ہوا، بعد میں مارک نے بھی مقامی کرکٹ میں اپنی عمدہ کارکردگی سے سلیکٹرز کو اپنی جانب متوجہ کیا اور قومی ٹیم میں شامل ہوا۔ ہمیں اس بات کا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ہم دونوں بھائی ضرور ٹیسٹ ٹیم میں شامل ہوں گے۔

س..... کیا کبھی آپ دونوں بھائیوں کے درمیان اختلاف ہوئے ہیں؟

(مجیب ربانی، سرائے سدھو)

اسٹیوواہ..... چھوٹے موٹے اختلافات تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن وہ صرف وقتی ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم پھر آپس میں بات چیت شروع کر دیتے ہیں۔

س..... آپ ایک عظیم آل راؤنڈر ہیں خود آپ بیٹنگ اور بولنگ میں کس چیز کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟

(مختار حسن ہاشمی، نثار احمد ہاشمی، کراچی۔ رباب طاہرہ، گجرات۔ محمد علی، لاہور)

اسٹیوواہ..... میں بیٹنگ کر کے زیادہ لطف اندوز ہوتا ہوں، آپ نے مجھے عظیم آل راؤنڈر کہا، اس پر آپ کا شکریہ۔

س..... اسٹیوواہ ہم آپ کے بڑے مدّاح ہیں ہمیں آپ سے ملنے اور خط و کتابت کرنے کا بہت شوق ہے۔ پلیز ہمیں اپنا ایڈریس دے دیجئے؟

(نسیم خان، نادر خان، سیالکوٹ)

اسٹیوواہ..... آپ مجھے درج ذیل پتے پر خط لکھ سکتے ہیں۔

C/O
Austration Cricket Board
70 Jolimount Street, Jolimount
Victoria 3002

س..... کچھ عرصے قبل ٹرائینگولر سیریز کے ایک میچ میں جب پاکستان کو میچ برابر کرنے کے لئے آخری گیند پر کچھ رنز درکار تھے آصف مجتبیٰ بیٹسمین تھے اور آپ بولر تھے اور اس آخری گیند پر آصف نے آپ کو چھکا لگا دیا تھا۔ آپ کو اس وقت کیسا محسوس ہوا؟

(عنایت اللہ اعوان، کندھ کوٹ۔ پرنس ملک سرفراز احمد، ملتان)

اسٹیوواہ..... آصف مجتبیٰ اس دن بہت فارم میں تھے۔ پورا میچ انہوں نے جتایا تھا۔ اور ایک ہارا ہوا میچ آخری گیند پر چھکا لگا کر برابر کرا دیا تھا۔ چھکا کھانے کے بعد ظاہر ہے میں بہت شرمندہ سا تھا۔ لیکن کرکٹ میں یہ سب تو ہوتا ہی ہے۔

س..... آپ تیز بولنگ کراتے کراتے اچانک چینج آف پیس کرتے ہیں یعنی ایک دم ہلکی بولنگ کراتے ہیں۔ ایسی گیند آپ یہ سوچ کر تو نہیں کراتے ہیں کہ یہ بیٹسمین تو بچہ ہے۔ ایسی گیند پر ہی آؤٹ ہو جائے گا؟

(سید صولت علی جعفری، حیدر آباد)

اسٹیوواہ..... میں تو ایسا نہیں سوچتا مگر بیٹسمین ضرور یہ سوچتا ہے کہ یہ کیا بچوں والی گیند کرا دی اس نے۔ اور پھر الٹی سیدھی ہٹ لگانے کے چکر میں بولڈ یا کیچ ہو جاتا ہے۔

س..... اگر ہم آپ کی دعوت کریں اور کھانے میں پاکستانی مرچوں والی ڈشیں رکھیں تو کیا آپ اس پر خلوص دعوت کو قبول کر لیں گے؟

(شہلا صدیقی، ٹنڈو آدم)

اسٹیوواہ: میں ضرور آپ کی دعوت قبول کرتا مگر

مجبوری یہ ہے کہ ہمارا یہ دورہ زیادہ طویل نہیں ہے۔ اور شیڈول بہت سخت ہے۔ بہرحال آپ کی دعوت کا شکریہ۔

س..... کیا آپ کے ملک میں کرکٹ کے کھیل میں سفارش چلتی ہے؟

(رضوان عطااللہ کھوکھر، گجرانوالہ)

اسیٹو واہ..... جناب ہمارا ملک اسی دنیا ہی میں واقع ہے۔ اور دنیا میں جو جو برے کام ہوتے ہیں وہ ہمارے ملک میں بھی ہوتے ہیں۔

مارک واہ

سوال: اگر آپ کو کسی اور ملک کی ٹیم سے کھیلنے کی آفر ہو اور وہ آپ کو کپتان بنانے کے ساتھ ساتھ بھاری رقم بھی دے رہے ہوں تو کیا آپ آسٹریلیا کی ٹیم کو چھوڑ دیں گے یا اس خصوصی آفر کو ٹھکرا دیں گے؟ (اویس یوسف زئی، اٹک)

مارک واہ..... بالکل ٹھکرا دوں گا کیونکہ کپتانی کا مجھے شوق نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ میں کپتانی اور روپے کے لالچ میں اپنے ملک سے غداری نہیں کر سکتا کیونکہ میں آج جو بھی ہوں وہ آسٹریلیا کی وجہ سے ہی ہوں۔

س..... آپ ۹۹ رنز پر بیٹنگ کر رہے ہوں اگلے اینڈ پر آپ کے بھائی اسیٹو ہوں اور وہ آپ کو رن آؤٹ کرا دیں تب آپ کے تاثرات کیا ہوں گے؟

(محمد فاروق ضمیر، لاہور)

مارک واہ..... غصہ تو آئے گا۔ مگر کیا کر سکتے ہیں اس لئے تھوڑی دیر بعد پھر ریلیکس ہو جاؤں گا، کیونکہ کوئی جان بوجھ کر تو رن آؤٹ نہیں کراتا ہے۔

س..... اگر آپ کی ملاقات شیطان سے ہو جائے تو آپ کیا کہیں گے؟

(ہمانقوی، گڈو)

مارک واہ..... ہمانقوی تو گڈو میں ہے تم میرے پاس کس لئے آئے ہو؟

س..... اگر میں آپ سے ایک زبردست سا جھوٹ بولنے کی فرمائش کروں تو آپ کیا کہیں گے؟

(خالد احمد پاشا، کراچی)

مارک واہ..... آپ کا سوال بہت زبردست ہے۔ (دیکھا آپ کی فرمائش پوری کر دی نا)

میکڈرمٹ

س..... فرض کریں آپ اپنا آخری ٹیسٹ میچ کھیل رہے ہوں میچ کی آخری گیند ہے آپ کی کل ۳۹۹ وکٹیں ہیں بیٹسمین شاٹ کھیلتا ہے اور آپ ڈائیو لگا

کر گیند کو خود اپنی گیند پر کیچ کر لیتے ہیں۔ گیند زمین سے چھو جاتی ہے مگر امپائر کو یہ بات محسوس نہیں ہوتی ہے اور وہ آؤٹ دے دیتا ہے اس وقت آپ کیا کریں گے اسپورٹس مین اسپرٹ کا مظاہرہ یا کرکٹ میں سب چلتا ہے کے مصداق آؤٹ لے لیں گے؟

(ندیم اکرم بٹ، سیالکوٹ)

میکڈرمٹ: آپ کے اس سوال نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ خیر کبھی ایسا موقع آئے گا تبھی دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے؟

س..... میں آپ کی بولنگ سے بے حد متاثر ہوں حد تو یہ ہے کہ میں میچ میں آپ ہی کے اسٹائل سے بولنگ کرانے کی کوشش کرتا ہوں جس کی وجہ سے لوگ مجھے بھی آپ کے نام سے پکارتے ہیں کیا آپ مجھے بولنگ کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

(سجاد جان قریشی، پٹارو)

میکڈرمٹ: مجھے بڑی خوشی ہے کہ پاکستان میں بھی میرے آپ جیسے پرستار موجود ہیں۔

فلیمنگ

س..... فلیمنگ اپنے کیریئر کا اہم ترین واقعہ بتائیے؟

(اکرم فدا، مکران)

فلیمنگ..... حالیہ دورے کے دوران ہیٹ ٹرک کرنا میرے کیریئر کا اہم ترین واقعہ ہے۔

س..... پاکستان کے اسی دورے میں آپ کو کس بیٹسمین نے متاثر کیا؟

(علی رضا، حیدر آباد)

فلیمنگ..... پاکستانی کرکٹ ٹیم کے کپتان سلیم ملک کی بیٹنگ نے ہماری پوری ٹیم کو بے حد متاثر کیا۔

س..... آپ کے آئیڈیل فاسٹ بولر کون ہیں؟

(نوید ہاشمی، کراچی)

فلیمنگ..... میرے آئیڈیل فاسٹ بولر غظیم ڈینس للی ہیں۔ انہوں نے مجھے بولنگ کے بارے میں کافی کچھ بتایا ہے۔

این ہیلی

سوال..... پاکستان کے دورے کے دوران کراچی ٹیسٹ میں آپ نے فیصلہ کن لمحات میں انضمام الحق کا اسٹمپ چانس ضائع کیا تھا جس کے نتیجے میں آپ لوگ وہ میچ ہار گئے تھے آپ کے کیا تاثرات تھے؟

(فیروز جمیل شیخ، مسعود جمیل شیخ، کراچی)

ہیلی..... بہت زیادہ افسردہ تھا کہ یہ مجھ سے کیسی غلطی ہو گئی۔ اصل میں شین وارن کی وہ گیند انضمام اور میں دونوں ہی نہیں سمجھ سکے تھے۔

برفانی تودہ

پاکستان میں سب سے بڑا برفانی تودہ ہپر ہے یہ دنیا بھر میں طوالت کے لحاظ سے ساتویں نمبر پر ہے۔

جانوروں نے بھی لڑی جنگ

عنوان پر نظر پڑتے ہی آپ ضرور چونکے ہوں گے اور آپ کے ذہن میں یہ خیال فوراً آیا ہو گا کہ شاید یہ کوئی گھوڑوں اور ہاتھیوں کا ذکر ہے جو پرانی جنگوں میں استعمال ہوتے رہے ہیں تو جناب آپ کا خیال کسی حد تک درست ہے لیکن تھوڑا سا مختلف، کیونکہ جن جانوروں کے بارے میں آپ سوچ رہے ہیں وہ کافی بھاری بھر کم ہیں لیکن جن کے بارے میں ہم بیان کر رہے ہیں وہ تو بالکل عام سے ہیں۔ یہ وہ جانور ہیں جنہیں ویت نامی جنگجوؤں نے امریکہ کے خلاف جنگ کے دوران استعمال کیا۔ یہ جنگ عجیب و غریب قسم کی تھی۔ اس میں امریکہ کے سارے جدید ہتھیار بے کار ثابت ہوئے اور آخر کار امریکہ کو شکست تسلیم کر کے ویت نام سے نکل جانا پڑا۔

شمالی ویت نامیوں کے پاس اس وقت ہوائی جہاز نہیں تھے اور نہ ویسے ہتھیار تھے جو جنگ جیتنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس عقل تھی جس کی مدد سے انہوں نے امریکی فوجیوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ یہ جنگ زیادہ تر ویت نام کے جنگلوں میں لڑی گئی۔ امریکی فوج نے بھی جنگل ہی میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ چونکہ انہیں ہوائی حملے کا خطرہ نہیں تھا۔ اس لئے امریکی فوجی اپنے کیمپوں میں راتوں کو لیمپ وغیرہ جلا کر رکھتے تھے۔ ویت نامیوں کو معلوم تھا کہ اندھیری رات کو جہاں

کہیں روشنی دیکھتی ہے وہاں جا پہنچتی ہے لہٰذا ویت نامی لومڑیاں پکڑ کر لاتے اور ان کے جسم پر ٹائم بم اور آتش گیر مادہ باندھ دیتے اور امریکی کیمپوں کے قریب چھوڑ کر خود بھاگ جاتے۔ لومڑیاں سیدھی روشنی کی طرف لپکتیں اور کیمپوں کے اندر جا پہنچتیں۔ ذرا سی دیر میں ٹائم بم کا وقت پورا ہو جاتا اور وہ پھٹ پڑتا اور سارے فوجی ہلاک ہو جاتے تھے۔ امریکیوں نے بھی جواباً کچھ ایسی ہی جنگی چالیں چلیں۔ انہوں نے تقریباً ایک ہزار کتوں کو ایسی ٹریننگ دی کہ وہ بارودی سرنگوں اور ویت نامیوں کی موجودگی کا پتہ لگا لیتے تھے ان میں سے بعض کتوں کے پاؤں کے ساتھ ٹرانسمیٹر بھی باندھ دیئے جاتے تھے اور انہیں کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ کتے ویت نام کے جنگلوں میں دور دور تک نکل جاتے اور جہاں کہیں بھی انہیں ویت نامی جنگجو دکھائی دیتے۔ ان کے پاؤں کے ساتھ لگے ہوئے ٹرانسمیٹر پیچھے ہیڈ کوارٹر کو بتا دیتے کہ فلاں مقام پر دشمن موجود ہے۔

شمالی ویت نامی ان کتوں کی کارکردگی سے سخت پریشان تھے کیونکہ ان کتوں نے انہیں بہت نقصان پہنچایا تھا۔ مگر شاید ویت نامی، امریکیوں سے زیادہ چالاک اور ذہین تھے۔ ان تربیت یافتہ کتوں کے خلاف ویت نامیوں نے جو حربہ استعمال کیا اس پر امریکی بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کتا جہاں کہیں بلی کو دیکھتا ہے اس کے پیچھے ضرور بھاگتا ہے۔ ویت نامیوں نے بلیاں اکٹھی کر لیں۔ جہاں کہیں امریکیوں کے کتے جاتے، ویت نامی ایک دو بلیاں وہاں چھوڑ دیتے۔ تمام کتے جونہی بلی کو دیکھتے، اس کے پیچھے دوڑ پڑتے۔ اس تعاقب کا نتیجہ یہ نکلتا کہ کتے اپنی ڈیوٹی سے بھاگ جاتے اور بلی انہیں دور فوجی ٹھکانے کی طرف لے جاتی جہاں ان کی اچھی طرح تواضع کی جاتی تھی۔

ویت نام کے جنگلوں میں ایک ایسا جانور بھی تھا جو غیر جانبدار تھا۔ یہ تھا شیر۔ جنگ کی وجہ سے جنگلوں میں دن رات گولیاں چلتی رہتی تھیں۔ شیر شکار نہ ملنے کی وجہ سے قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جہاں کہیں انہیں کوئی انسان نظر آتا، شیر ان پر حملہ کر دیتے اور ایک ہی سانس میں چٹ کر جاتے تھے۔

شمالی ویت نامیوں کو معلوم ہو گیا کہ شیر جنگل کے کس حصے میں پائے جاتے ہیں انہوں نے خود تو اس جنگل میں جانا چھوڑ دیا۔ لیکن ایسی جنگی چالیں چلیں کہ امریکی فوج جنگل کے اس حصے میں چلی گئی بلکہ کسی حد تک محصور ہو کر رہ گئی، جہاں شیروں کا ٹھکانہ تھا۔ غصے اور بھوک کے مارے شیروں نے فوراً ہی امریکیوں پر حملہ کر دیا اور چیر پھاڑ کر رکھ دیا

ویت نام کی اس جنگ میں جانوروں نے دونوں فریقوں کی طرف سے لڑائی لڑی۔ لیکن ویت نامیوں نے ان جانوروں کا عقل مندی سے استعمال کیا اس وجہ سے جیت ان کے حصے میں آئی۔ ان کے کارنامے بعد میں جب امریکی حکومت کے علم میں آئے تو وہ بھی حیران ہوئی کہ اسے کیسی چالاک اور ذہین قوم سے واسطہ پڑا تھا۔

ادارہ

عکس ابھرے کئی چہرے

مولانا حسرت موہانی

وجۂ شہرت

تحریک پاکستان

عظیم شاعر. بے خوف صحافی، بے لوث رہنما، حسرت موہانی کا اصل نام فضل الحسن تھا۔ حسرت تخلص کرتے تھے۔ موہان میں پیدا ہوئے۔ فتح پور اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے ہفت روزہ، "اردوئے معلیٰ" جاری کیا جو ۱۹۳۰ء تک وقفوں سے چھپتا رہا۔ ۱۹۰۸ء میں حکومت مخالف مضمون لکھنے پر انگریز حکومت نے حسرت موہانی کو چار سال قید بامشقت کی سزا سنائی اس کے بعد وہ تمام عمر ہی مصائب سے دوچار رہے۔ وہ مسلم لیگ کے فعال کارکن تھے۔ تحریک خلافت اور دیگر متعدد تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۲۱ء میں مسلم لیگ کے آلہ آباد کے جلسے کی صدارت کی۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے خلاف احتجاجی مہم چلائی۔ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ حسرت سادہ طبیعت کے خالص، ارادے کے پکے اور اپنے موقف پر ڈٹ جانے والے سچے انسان تھے۔

حسن علی آفندی

وجۂ شہرت

تحریک پاکستان

آپ ضلع ہالہ کے ایک گاؤں میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ذاتی محنت اور قابلیت سے تعلیم حاصل کی اور وکالت کا پیشہ اپنایا۔ تعلیم کے حصول میں پیش آنے والی مشکلات نے آپ کو ایسا تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی طرف راغب کیا جس میں مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ آپ جسٹس امیر علی کی دعوت پر کلکتہ گئے۔ وہاں تعلیمی نظام کا قریب سے مشاہدہ کیا اور ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرستہ السلام کی بنیاد رکھی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے بھی ابتدائی تعلیم یہیں سے حاصل کی تھی۔ حسن علی آفندی نے ہی میریٹ روڈ کراچی پر مسلمان طالبات کے لئے بھی سب سے پہلا اسکول کھولا۔ ان کا انتقال ۲۰ اگست ۱۸۹۶ء میں حیدر آباد میں ہوا اور اپنے ذاتی باغ میں دفن ہوئے۔ ان کی کوششوں سے سندھ برصغیر کے نمایاں تعلیمی مراکز میں شمار ہونے لگا۔ انہیں "سندھ کا سرسید" بھی کہا جاتا ہے۔

اچھے ساتھیو! "عکس ادھورے کیجئے پورے" کا یہ آخری مقابلہ تھا۔

اس کی جگہ نیا کوئز "اب میں کیا کروں" شروع کیا جارہا ہے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے ساتھی

مہوش احمد جعفر، ڈیرہ اسماعیل خان۔

دُرست جواب دینے والے ساتھی

سیدہ صاعقہ ضیا، نواب شاہ۔ سائرہ سلطان، کراچی۔ ندیم اقبال، رحیم یار خان۔ وسیم احمد، حیدر آباد۔ راشدہ بشیر حیدر آباد۔ محمد کاشف، حیدر آباد۔ شبنم عقیل الرحمٰن راجپوت، حیدر آباد۔ عاقل خالق قریشی، حنا خالق قریشی، عامرہ خالق قریشی، نعمان رفیق قریشی، شاہدہ رفیق قریشی، ایبٹ آباد۔ سیما عقیل الرحمٰن راجپوت، حیدر آباد۔ سید وقار حسین، سید وقاص حسین، لاہور۔ رشیدہ طٰہٰ، کراچی۔ محمد عمر، راولپنڈی۔ سید عثمان حسنی، لاہور۔ حسیب اللہ، پشاور۔

جن ساتھیوں کے جوابات ہمیں ۱۰ تاریخ تک موصول ہوئے

اقبال حیدر جمالی، دادو۔ رضوان اللہ خان، سکھر، شبنم جمالی۔ دادو، حسن عباس، ساہیوال۔ ذکاء اللہ نذیر، فیصل آباد۔ نوید اقبال قریشی، حیدر آباد۔ صائمہ کنول، عظمیٰ کنول، حیدر آباد۔ جاوید اقبال، کنہوروی، حیدر آباد۔ اسماعیل عبدالرحمان، کراچی۔ محمد ریحان، فیصل عرفان، سہیل عرفان، طیبہ عرفان، نائیلہ فیصل، سمیّہ فیصل، اسلام آباد۔ عدیل احمد عدی، مدثر احمد، کراچی۔ جویریہ تھانوی، محمد حذیفہ تھانوی، کراچی۔ عفّان حکیم خان، کراچی۔ محمد اسلم، ولی محمد، ساہیوال۔

اب میں کیا کروں؟

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مسئلہ پریشان کر کے رکھ دیتا ہے اور لاکھ کوشش کے باوجود اس کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔ تب دوسروں سے مشورہ کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ "آنکھ مچولی" میں اس مہینے سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ اس کالم میں آپ اپنا مسئلہ بھیج سکتے ہیں، اس مسئلے کو قارئین آنکھ مچولی ہی حل کریں گے۔ اگر کوئی ساتھی اپنا نام پوشیدہ رکھنا چاہیں تو وضاحت کر دیں، ان کا نام شائع نہیں کیا جائے گا۔ اور بہترین حل پر انعام بھی دیا جائے گا۔ اس مہینے ایک مسئلہ پیش کیا جارہا ہے۔ قارئین اس کا حل ۸ر فروری تک بھیج دیں۔

مسئلہ: میری والدہ کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ میری پرورش میرے نانا جان اور نانی جان کے گھر ہوئی۔ ان دونوں نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں ان ہی کو اپنا سگا باپ اور سگی ماں سمجھنے لگا۔ میرے ابو نے دوسری شادی کر لی اور وہ بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے مجھے کیوں چھوڑ دیا اور کیوں مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ میرا کبھی کبھی بہت دل چاہتا ہے کہ ان سے جا کر ملوں اور پوچھوں۔ مجھے یہ بھی خیال آتا ہے کہ شاید وہ بے قصور ہوں اور نانا جان اور نانی جان ہی مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر بضد ہو گئے ہوں۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں یہ باتیں ان سے پوچھ نہیں سکتا کیونکہ انہیں صدمہ ہو گا۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے جارہے ہیں اپنے ابو سے ملنے کی خواہش مجھ میں بڑھتی جارہی ہے۔ آخر وہ میرے باپ ہیں، ہو سکتا ہے وہ بھی مجھ سے ملنے کے لئے تڑپتے ہوں۔ ان سے ملنے کے لئے سوچتا ہوں تو دوسری طرف نانا اور نانی جان کا خیال آجاتا ہے کہ وہ کیا سوچیں گے کہ زندگی بھر کی محنت اور محبت کا یہ صلہ دیا؟

آپ ہی بتایئے میں کیا کروں۔

(م، الف۔ کراچی)

اور کوّے کی چونچ ٹوٹ گئی

محمد بن مالک

کوّے میاں کافی دیر سے کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں تھے، مگر آج شاید ان کی قسمت خراب تھی۔ بنگلے کی منڈیر پر بیٹھے بیٹھے ان کی سوکھی ہوئی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں، پر سکڑ گئے تھے اور گردن ڈھیلے ڈھالے انداز میں آگے کو جھک گئی تھی۔ اب تو دوپہر ہونے کو آئی تھی لیکن کسی نے بھی ابھی تک اپنے گھر سے باہر گلی میں کوئی ایسی چیز نہیں پھینکی تھی جس سے کوّے میاں اپنے مختصر سے پیٹ کا دوزخ بھر سکتے۔ گلی خلاف معمول بالکل صاف ستھری تھی، شاید حکومت کا کوئی عہدے دار اس علاقے کا دورہ کرنے آرہا تھا۔ کافی دیر پہلے ہی کوّے میاں اڑ کر تمام علاقے کا جائزہ لے چکے تھے، مگر ہر جگہ انہیں ناکامی اور مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بنگلوں کے اندر وہ پہلے جھانک چکے تھے مگر وہاں بھی انہیں اپنے مطلب کی کوئی چیز نظر نہ آسکی۔ بالآخر وہ تھک ہار کر ایک بنگلے کی منڈیر پر جا بیٹھے کہ شاید میرا رزق مجھے تلاش کرتے کرتے خود ہی آن پہنچے۔ رزق تو ان تک کیا پہنچتا، البتہ ایک موٹی تازی بلی

کسی طرح منڈیر پر آگئی اور انہیں اُڑ کر قریبی ناریل کے درخت پر بیٹھ جانا پڑا۔ بلّی منڈیر پر انہی کی جگہ پر بیٹھ کر انہیں خونخوار نظروں سے گھورنے لگی۔

کوّے میاں کی قوتِ برداشت اب جواب دے رہی تھی۔ ان کا بس چلتا تو وہ منڈیر پر بیٹھی ہوئی موٹی تازی بلّی کی پیٹھ کی کھال پھاڑتے اور پھر اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا جاتے۔ بلّی کے بھی ان کے بارے میں کچھ اسی قسم کے خیالات تھے کیونکہ وہ بھی بھوکی تھی اور مسلسل انہیں گھورے جا رہی تھی۔

قریب تھا کہ کوے میاں مارے کمزوری کے پٹ سے زمین پر گر جاتے اور بلّی خانم کی بھوک مٹا جاتے کہ ان کے کانوں میں ایسی آوازیں آنے لگی، جیسے کوئی چھالیہ کتر رہا ہے..... "کتر..... کتر ..... کر..... کر..... کتر....." انہوں نے بے خود سا ہو کر دیکھا۔ ناریل کے درخت سے تھوڑے ہی فاصلے پر اسی سے ملتا جلتا، مگر چھوٹا اور پتلا، چھالیہ کا درخت موجود تھا۔ اس کی ایک شاخ پر گلہری بیگم بیٹھی، اپنے دانتوں کے سروتے سے چھالیہ کتر کتر کے اس کے دانے ایک بڑے سے پتے پر پھیلاتی جا رہی تھیں۔ کوے میاں کی آنکھیں چمکنے لگیں اور چونچ میں پانی بھر آیا۔ گلہری بیگم سے چھالیہ مانگنا بے سود تھا، کیونکہ وہ ہمیشہ ٹکا سا جواب دے دیتی تھیں۔ "میاں جی..... محنت کرو محنت.....! اپنی مدد آپ.....!! مَردُوّے، ہو کر عورتوں سے مانگتے شرم نہیں آتی؟"

کوے میاں کو اگر چھالیہ حاصل کرنا تھی تو اس کے لئے انہیں کوّے پن "یعنی سیانے پن" سے کام لینا ضروری تھا ورنہ شرافت کی راہ سے تو بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ کسی قابلِ عمل منصوبے کی تیاری کے لئے انہوں نے چھالیہ کے درخت کا بغور جائزہ لینا شروع کیا۔ جس پتے پر گلہری بیگم کی کتری ہوئی چھالیہ بکھری ہوئی تھی اس کے عین اوپر ایک مضبوط شاخ موجود تھی۔ کوے میاں اگر کسی طرح گلہری کی نظروں میں آئے بغیر اس شاخ پر بیٹھنے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ آرام سے چھالیہ کے دانے "چگ" سکتے تھے۔ گلہری بیگم کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو پاتی۔ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے اُڑان بھری اور آسمان کی سیدھ میں اوپر ہی اوپر اڑتے چلے گئے۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ چھالیہ کے درخت کے عین اوپر آگئے ہیں تو پھر انہوں نے آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع کر دیا۔ جس طرح پیراشوٹر زمین پر اترتے ہیں۔ اور بڑی آہستگی سے اپنی مطلوبہ شاخ پر آ کے بیٹھ گئے۔ گلہری بیگم کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی۔ وہ اپنی دُھن میں مگن چھالیہ کے دانے کتر کتر کے پتے پہ رکھتی رہیں اور کوے میاں ٹھونگیں مار مار کر انہیں نگلتے رہے۔ ان کا پیٹ نصف سے زائد بھر چکا تھا اور وہ اسے اچھی طرح بھر لینا چاہتے تھے تاکہ آئندہ چند وقتوں تک بے فکری نصیب ہو سکے۔ بُرا ہو بلّی خانم کا..... انہوں نے کوے میاں کو مفت کی چھالیہ توڑتے دیکھ لیا۔ انہیں کوے میاں کی یہ حرکت

ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ منڈیر پر بیٹھے بیٹھے چلائیں:
"اری گلہریا! دیکھ ذرا، وہ نامُراد کلوٹا تیری ساری چھالیہ لے اڑا۔"

گلہری بیگم اب تک یہ سمجھ رہی تھیں کہ ان کی چھالیہ ہوا کے زور کی وجہ سے زمین پر گر رہی ہے، وہ یہ سوچ کو مطمئن تھیں کہ بعد میں اٹھالیں گی، لیکن بلی خانم کی پکار پر انہوں نے دیکھا تو واقعی ان کے سر کے اوپر والی شاخ پر کوے میاں موجود تھے جو کہ یقیناً اپنی گردن لانبی کر کے چھالیہ کھاتے رہے تھے پھر قبل اس کے کہ کوّے میاں وہاں سے رفوچکّر ہوتے، گلہری بیگم غضبناک ہو کر اچھلیں اور ان کی چونچ اپنے مضبوط دانتوں میں دبوچ لی۔

"اف..... ہائے ہائے ہائے..... کائیں کائیں کائیں..... چھوڑو مجھے....." کوے میاں تکلیف کی شدّت سے چیخے۔ ان کے پر ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ شاخ پر سے ان کے قدم اُکھڑ گئے تھے اور وہ صرف اپنی چونچ کے سہارے فضا میں جھول رہے تھے جو کہ گلہری بیگم کے جبڑوں کی گرفت میں تھی۔

"کیوں چھوڑ دوں تجھے کم بخت حرام خور! کیسے مزے سے میری ساری چھالیہ کھا گیا نگوڑا..... کلموہا کہیں کا!! تیرا ستیاناس جائے، خدا تجھے غارت کرے نا مراد کلوٹے! میری محنت برباد کر دی تونے!!" گلہری بیگم منہ بھینچے اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھیں — کوے میاں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے چونچ چھڑانے کے لئے کئی جھٹکے دیئے مگر ناکام رہے — ادھر منڈیر پر بیٹھی ہوئی بلی خانم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ منتظر تھیں کہ کب کوے میاں بے دَم سے ہو کر زمین پر گرتے ہیں — کوے میاں کا پیٹ بھر گیا تھا، اب ان کا پیٹ بھرنا باقی رہ گیا تھا —!!

کوے میاں اور گلہری بیگم دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ گلہری بیگم غصے اور غم کی وجہ سے رو رہی تھیں اور کوے میاں تکلیف کی شدت سے! — کوے میاں کو اپنی چونچ جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ انہوں نے اپنی رہی سہی ہمت اور طاقت مجتمع کی اور اپنے گروجی کا نام لے کر آخری جھٹکا مارا۔ اس بار وہ کامیاب رہے۔ گلہری سے انہوں نے اپنی چونچ تو چھڑوالی لیکن چونچ کے نچلے پٹ کا نصف حصہ ٹوٹ کر گلہری بیگم کے منہ میں ہی رہ گیا، جسے وہ مالِ غنیمت سمجھ کر نگل گئیں اور خود کوے میاں "دھپ" سے زمین پر آن گرے۔

بلی خانم کو اسی موقع کا تو انتظار تھا۔ انہوں نے بنگلے کی منڈیر سے ایک لمبی جست لگائی اور قریب تھا کہ وہ کوے میاں کو چھاپ لیتیں کہ اچانک ان کے سامنے کوئی آگیا اور "ہش..... ہش....." کر کے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

وہ ایک بچہ تھا..... معصوم اور بھولا بھالا سا۔ اس کے کاندھے پر بستہ لٹکا ہوا تھا اور وہ اسکول یونیفارم میں ملبوس تھا۔ کوے میاں کی ٹوٹی چونچ دیکھ کر بچے کی آنکھوں میں افسردگی دوڑ گئی۔ اس

نے آگے بڑھ کر انہیں ہاتھوں میں اٹھالیا۔

"کائیں کائیں کائیں ....." وہ درد کی شدت سے چلّائے، اور بے ہوش ہو گئے۔

کوے میاں کو جب ہوش آیا تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک گھر کے صحن میں پایا۔ ان کے سامنے دو ڈونگیاں پڑی تھیں جن میں پانی اور دانہ دُنکا وغیرہ موجود تھا۔ قریب ہی بچہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ گلہری سے ہونے والے جھگڑے اور بے ہوشی کی وجہ سے ان کے پیٹ میں موجود تمام چھالیہ ہضم ہو چکی تھی اور انہیں دوبارہ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔انہوں نے دانے والی ڈونگی میں منہ ڈالا اور دانہ کھانے کی کوشش کی۔ مگر چونکہ چونچ کا نچلا پٹ نصف ٹوٹا ہوا تھا اس لئے وہ ایک دانہ بھی اپنی چونچ سے نہ پکڑ سکے۔ صرف اوپری پٹ کی مدد سے کوئی چیز پکڑنا ناممکن تھا۔ کوے میاں نے بڑی کوشش کی مگر کچھ بھی نہ کھا سکے۔ تنگ آکر انہوں نے پانی کی ڈونگی میں چونچ ڈال دی مگر یہاں بھی وہی ہوا۔ آخر انہیں اپنی چونچ جڑ تک پانی میں ڈال کر کبوتر کی طرح "غٹ غٹ" کر کے پانی پینا پڑا۔ حالانکہ پہلے وہ چونچ بار بار اوپر اُٹھا اُٹھا کر پانی حلق سے نیچے اتارتے تھے۔

"کائیں کائیں کائیں ....." کوے میاں بری طرح جھنجھلائے ہوئے تھے۔ بی گلہری نے انہیں بڑا سخت نقصان پہنچایا تھا۔ گلہری بیگم نے نہ صرف ان کی چونچ توڑی تھی بلکہ انہیں ایسے ایسے کوسنے دیئے تھے جو ان کی بیگم نے بھی انہیں کبھی نہیں دیئے تھے۔ اب وہ اپنے مستقبل کی طرف سے سخت فکر مند تھے۔ پہلے انہیں صرف ایک سوال پریشان کیا کرتا تھا۔ "کھائیں گے کہاں سے؟" اب ایک اور سوال پریشان کرنے لگا تھا، "کھائیں گے کیسے؟"

ننھا بچہ قریب بیٹھا بڑے غور سے کوے میاں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کوے میاں ٹوٹی ہوئی چونچ کی وجہ سے کھانے کے قابل نہیں رہے۔ وہ اٹھا اور اپنی امی سے جا کر پوچھنے لگا کہ کوے کو کس طرح کھلایا جائے؟ اس نے جب "امی" کہا تو کوے میاں کے ذہن میں ایکدم کوندا سا لپکا۔ انہیں یاد آیا کہ جب ان کے اپنے بچے چھوٹے تھے تو وہ اپنی چونچ سے دانہ اٹھا کر ان کی چونچ میں ڈالا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ خود کھانے کے قابل نہیں تھے۔ اس کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ جب وہ اپنے بچوں کے پاس جائیں گے تو ضرور وہ کھانے کے سلسلے میں ان کی مدد کریں گے کیونکہ اب وہ خود کھانے کے قابل نہیں رہے ہیں۔

یہ سوچ کر کوے میاں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے وہ فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ ان کا رخ اس علاقے کی طرف تھا جہاں ان کے بچے رہتے تھے۔ جس وقت کوے میاں اپنے بچوں کے علاقے میں پہنچے ..... ان کے بچے اپنے بچوں کو دانہ دُنکا کھلا رہے تھے۔

"کائیں کائیں کائیں۔ آؤ ابا، کیسے آنا ہوا؟"

"بس ایک مجبوری کھینچ لائی ہے!" کوے میاں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"کون سی مجبوری ابا، ارے تمہاری تو چونچ بھی ٹوٹی ہوئی ہے..... کائیں کائیں کائیں....."

"ہاں بیٹا! ایک حادثے کی نذر ہو گئی۔ اس کی وجہ سے اب میں خود کچھ کھانے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ اسی سلسلے میں میں تم لوگوں کے پاس آیا ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا جب تم لوگ چھوٹے تھے اور خود سے کچھ کھا نہیں سکتے تھے میں دانہ دنکا اٹھا کر تمہاری چونچوں میں ڈالتا تھا۔ اب یہی صورتحال مجھے درپیش ہے، چنانچہ میں تم سے اسی سلوک کا طلبگار ہوں جو میں نے تم لوگوں کے ساتھ کیا تھا۔!!"

ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ غالباً تمام کوّے اپنے ابا کی بات سمجھ گئے تھے۔ دفعتاً ایک بھاری بھرکم اور زیادہ کالا بھجنگ کوا بولا۔ "معاف کرنا ابا! ہمارے بچے پہلے ہی زیادہ ہیں۔ ان کو کھلانے پلانے میں ہمارا پورا دن صَرف ہو جاتا ہے، ہم تم کو کس طرح کھلائیں گے؟"

"اور کیا!" دوسرے کوّے نے اپنے بھائی کی حمایت کی، "تم نے اپنے بچوں کو کھلایا پلایا..... بہت اچھا کیا۔ لیکن ہم بھی تو اپنے بچوں کو کھلا پلا رہے ہیں۔"

"ہماری طرف سے تمہیں یہاں رہنے کی پوری اجازت ہے۔ لیکن اپنے کھانے پینے کا بندوبست تمہیں خود کرنا پڑے گا۔"

بے چارے کوے میاں اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بہت دل برداشتہ ہو کر وہ جس جگہ سے آئے تھے واپس وہیں چل دیئے۔ بھوک بہت زوروں کی لگ رہی تھی لیکن کچھ کھا نہیں سکتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا انکی بھوک اور کمزوری میں اسی قدر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ تھک ہار کے آخر وہ ایک مکان کی چھت کے کونے میں جا کر پڑ گئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اب تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ چھت پر پڑے پڑے کافی دیر گزر گئی تھی۔ اب ان پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ اوپر سے بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ یعنی کوے میاں کے مرنے میں اب کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔

"ارے امی جان! دیکھیں، یہ تو وہی کوا ہے جس کی چونچ ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس کی چونچ بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔" ایک بچے کی آواز کوے میاں کو سنائی دی تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کے اوپر وہی بچہ جھکا ہوا تھا جس نے انہیں نہ صرف بلی خانم کا نشانہ بننے سے بچایا تھا، بلکہ ان کی زخمی چونچ کی مرہم پٹی وغیرہ بھی کی تھی۔

"اوہ، تو کیا میں اسی بچے کے گھر میں موجود ہوں!" کوّے میاں نے سوچا، اگلے ہی لمحے انہوں نے خود کو نرم نرم ہاتھوں میں محسوس کیا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"چچ، چچ، چچ....." انہیں بچے کی ہمدردانہ آواز سنائی دی۔ "بیچارہ کئی دنوں کا بھوکا لگ رہا

ہے۔ شاید چونچ ٹوٹی ہوئی ہونے کی وجہ سے کچھ بھی نہیں کھا سکا ہے۔"

پھر ننھا بچہ کوے میاں کو اٹھا کر نیچے گھر میں لے گیا۔

"چچا جان! چچا جان!!" ننھے بچے نے کسی کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔

"کیا بات ہے ننھے میاں!" ایک طرف سے آواز آئی۔ "کیوں اتنا شور مچا رہے ہو؟"

کوے میاں نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ ننھے میاں کے چچا جان پچیس چھبیس سال کے لگ بھگ تھے اور ایک کرسی پہ بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

ننھے نے جواب دیا، "چچا جان۔ دیکھیں نا، اس بیچارے کوے کی چونچ پتہ نہیں کیسے ٹوٹ گئی۔ اب یہ کچھ کھا ہی نہیں پا رہا ہے۔ دیکھیں، مرنے کے قریب ہو گیا ہے۔"

چچا جان نے ننھے کے ہاتھوں سے کوے میاں کو لیا اور اس کی چونچ کا جائزہ لیتے ہوئے بولے، "یہ تمہیں کہاں سے ملا ہے؟"

"چھت پر پڑا ہوا تھا۔" ننھے نے مختصر جواب دیا۔ پھر تھوڑے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔ "چچا جان! آپ تو انجینئر ہیں۔ آپ ایسا کریں کہ اس کی ٹوٹی ہوئی چونچ کی جگہ پلاسٹک کی نقلی چونچ لگا دیں۔ تاکہ یہ کھانے کے قابل تو ہو سکے۔"

"نہیں بیٹا۔" چچا نے کہا۔ "پلاسٹک کی یا کوئی اور مصنوعی چونچ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکے گی۔ ہم اس کا کوئی اور علاج کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور کوا ننھے کے ہاتھوں میں پکڑا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک پیالی تھی جس میں تھوڑا سا پانی تھا۔

"یہ پانی اس کو پلا دو۔" انہوں نے پیالی ننھے کو دیتے ہوئے کہا۔

کوے میاں نے دو تین گھونٹ ہی پانی پیا ہو گا کہ ان پر ایک دم غشی طاری ہو گئی اور پھر ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

"ارے یہ تو مر گیا!!" ننھے نے گھبرا کر کہا۔

"مرا نہیں ہے، بے ہوش ہوا ہے۔" چچا بولے۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ اوزار نظر آ رہے تھے۔

"اب آپ کیا کریں گے؟ اسے حلال کر دیں گے!؟"

"ارے نہیں بھئی!" چچا نے ہنس کر کہا، "کوے کو حلال کر کے کیا کرنا ہے۔ تھوڑی سی اپنی انجینئرنگ دکھائیں گے۔ اس کی چونچ کا نچلا ٹوٹا ہوا پٹ تراش کر ہموار اور نوکیلا کریں گے۔ پھر اوپری پٹ تھوڑا سا کاٹ کر نچلے پٹ کے برابر اسی کے جیسا کر دیں گے۔ اس طرح یہ کوئی بھی کھانے کی چیز اپنی چونچ سے پکڑ کر آرام سے کھا سکے گا۔"

"ارے واہ! چچا زندہ باد!!" ننھے میاں نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔ "کیا زبردست آئیڈیا ہے!"

کوے میاں کو جب ہوش آیا تو انہیں اپنی چونچ کا حشر دیکھ کر سخت غصہ آیا۔ ان کی چونچ کبوتر کی چونچ سے بھی چھوٹی ہو گئی تھی۔

"کائیں کائیں کائیں۔" وہ سامنے بیٹھے ہوئے ننھے پر غصے سے چیخے جو ان کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ سمجھا کہ کوے میاں کو بھوک لگ رہی ہے۔ وہ ایک پلیٹ میں روٹی کے بہت سارے ٹکڑے ڈال کر لے آیا۔ کوے میاں نے غصے سے پلیٹ میں چونچ ماری تو ایک ٹکڑا ان کی چونچ میں آ گیا وہ اسے نگل گئے۔ پھر ایک ایک کر کے انہوں نے تمام ٹکڑے ختم کر ڈالے۔ پیٹ بھرنے کے ساتھ ہی ان کا غصہ بھی کافور ہو چکا تھا اور غصے کی جگہ احسان مندی اور ممنونیت کے جذبات نے لے لی تھی۔

"کائیں کائیں کائیں۔ بہت بہت شکریہ ننھے میاں تمہارا۔" کوے میاں نے چیخ کر ننھے کا شکریہ ادا کیا۔ پھر انہوں نے اُڑان بھری اور اڑتے ہوئے، مکان سے باہر آ گئے۔ ننھا خوش خوش انہیں جاتا دیکھ رہا تھا۔

اب کوے میاں بڑے آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگرچہ اُنکی چونچ مضحکہ خیز ہو گئی ہے اور سب جانور اُن کا مذاق اڑاتے ہیں، مگر وہ اب کسی بھی معاملے میں کسی کے محتاج نہیں ہیں اور خود کماتے اور کھاتے ہیں۔ اب وہ ہر کسی سے یہی کہتے پھرتے ہیں،

"جان ہے تو جہان ہے۔"

اقوال زریں

(۱) اطمینان قدرتی دولت ہے اور بے اطمینانی جعلی سکے۔

(۲) دوستوں کو کھو دینا سب سے بڑی غریبی ہے۔

(۳) ایک احمق کو اپنی مدح سرائی کے لئے کئی احمق مل جاتے ہیں۔

(۴) ایک آدمی کی حماقت دوسرے کی بدنصیبی اور سربراہ مملکت کی حماقت پورے ملک کی بدنصیبی ہوتی ہے۔

(۵) محنت اور کام کی لگن انسان کو بوریت اور بد اخلاقی سے اور ملک کو بدحالی سے محفوظ رکھتی ہے۔

(۶) جو شخص ایک مدرسہ قائم کرتا ہے وہ دراصل ایک جیل بند کرتا ہے۔

(۷) بچے سچائی کا دوسرا نام ہیں۔

(۸) فرض ایسا قرض ہے جس کو سوائے اپنے کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔

(۹) لالچ کرنا مفلسی، بے غرض ہونا امیری اور معاف کر دینا صبر ہے۔

(۱۰) جب نیکی تمہیں مسرت بخشے اور بدی غم میں مبتلا کرے، تب تم مومن ہو۔

مرسلہ:۔ عبدالستار خان طاہر، بورے والا۔

فرصت نہیں ہے

عائشہ صدیقہ

سبق یاد کرنے کی فرصت نہیں ہے
بہانے بنانے کی فرصت نہیں ہے

یہ انگلش کے اسباق ہیں یا بلا ہیں
ہمیں یاد کرنے کی فرصت نہیں ہے

پلس اور مائنس سمجھتے نہیں ہم
گھٹانے بڑھانے کی فرصت نہیں ہے

ہے مضمون کوئی یہ جومیٹری بھی!
مثلث بنانے کی فرصت نہیں ہے

یہ علمِ ریاضی، یہ کلیات اس کے
ہمیں یاد کرنے کی فرصت نہیں ہے

یہ جغرافیہ اور تاریخِ عالم
ہمیں تو سُنانے کی فرصت نہیں ہے

پہاڑوں سے بڑھ کر ہیں بوجھل پہاڑے
ہمیں بوجھ اُٹھانے کی فرصت نہیں ہے

ہمیں کام دیتے ہیں استاد صاحب
مگر کام کرنے کی فرصت نہیں ہے

بہت ڈانٹ سنتے ہیں ہم مدرسے میں
ہمیں داد پانے کی فرصت نہیں ہے

سمجھ دار بچوں سے ہے ہم کو نفرت
بھلے کام کرنے کی فرصت نہیں ہے

یہ اشعار میرے بہت دل پسند ہیں
مگر گُنگُنانے کی فرصت نہیں ہے

وہ کیا راز تھا؟

محمد عمران خان

بارہویں قسط

جواد چھوٹے بھائی کے ہاتھوں میں دستانے دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ اپنے انٹرویو کے سلسلے میں اسلام آباد جا رہا تھا۔ ٹرین کے سفر کے دوران اس کے ساتھ حیرت انگیز واقعات پیش آئے اور ہوٹل اسپائیڈر پہنچنے تک ان واقعات کی پُراسراریت اور سنسنی خیزی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ہوٹل اسپائیڈر میں آٹھ کا ہندسہ گردش کر رہا تھا۔ وہاں مکڑیوں پر حیرت انگیز تجربات کیے جا رہے تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب دنیا تھی جو انسانوں سے الگ تھلگ نظر آتی تھی۔

چھوٹی چھوٹی مکڑیاں سفید سفوف کھا کر بڑی بڑی بدہیت عفریتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ انہوں نے ہوٹل میں موجود لوگوں کو چیر پھاڑ ڈالا۔ مر کر زندہ ہونے والوں نے "آبِ حیات" سے غسل کیا تو سب کے زخم بھر گئے۔ آٹھ ہاتھ پیر والے بونے نے جواد کو باغ میں پھینک دیا تو خونی مکڑیاں اس پر جھپٹ پڑیں۔

ٹرکوں سے چپٹی ناک والے عجیب و غریب بونے اُتر رہے تھے۔ ان بونوں کو دیوارِ قید سے آزاد کرایا گیا تھا۔ بونوں کی یہ عجیب و غریب نسل پوری دنیا پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔

جواد نے ہرے رنگ کا مشروب پیا تو اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبنے لگا پھر جب اسے ہوش آیا تو وہ راولپنڈی

اسٹیشن کی ایک بینچ پر پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں تین تین اُنگلیاں بڑھ گئی تھیں اور اسے مکڑیوں کی طرح دیوار پر چڑھنے اور پلک جھپکتے میں لوگوں کے دماغ میں اُترنے کی صلاحیت حاصل ہو گئی تھی۔ دماغ میں اُترنے کی صلاحیت کا نام ٹیلی پیتھی تھا۔ ارم پیلس میں آگ لگی تو جواد نے انہیں صلاحیتوں کی بدولت نویں منزل میں پھنسے ہوئے بچے کو بچالیا..... ایک ہیٹ والا پُراسرار شخص مسلسل اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے جواد کے عمارت پر اُترنے چڑھنے کے دوران ایک طاقتور کیمرے سے اس مناظر کی کئی تصویریں کھینچیں۔ وہ پُراسرار شخص سائے کی طرح جواد کے ساتھ چل رہا تھا۔

گُجر بدمعاش راولپنڈی کا ایک بڑا بدمعاش تھا لیکن جواد نے ٹیلی پیتھی کی مدد سے اس کی ایک مونچھ کاٹ ڈالی۔ گُجر نے اپنے ساتھیوں کو مُرغا بننے کا حکم دیا اور خود کرسی اٹھا کر اپنے سر پر مارلی پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چکرا کر نیچے گر پڑا اسی وقت جواد اس کے دماغ سے باہر نکل آیا!!

(اب آگے پڑھئے)

گُجر بے ہوش ہو چکا تھا اور اب جواد کی ساری توجہ اس کے ساتھیوں کی طرف تھی جو چمکتے ہوئے لمبے پھل والے چاقو سنبھالے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے جواد یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے اُستاد کا ناقابلِ یقین انجام دیکھنے کے بعد کچھ خائف سے نظر آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ماٹا بدمعاش تھا جو ان میں سینئر تھا اور گجر کا دوسرا بازو خیال کیا جاتا تھا۔ اسی نے استاد گجر سے کہا تھا کہ اگر وہ اجازت دے تو لڑکے کی بوٹی بوٹی الگ کر دی جائے گی۔ اس وقت وہ سب سے آگے تھا۔ جواد نے اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھا تو وہ بری طرح سہما ہوا تھا۔ استاد گجر کے عبرت ناک انجام کو دیکھنے کے بعد اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے لیکن ساتھیوں کے سامنے اپنی بزدلی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے مجبوراً سب سے آگے تھا..... جواد نے اس کے دماغ پر مکمل قبضہ جمایا۔ ماٹے نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اسے نہ مارو..... دیکھتے نہیں اس نے استاد کا کیا حال کر دیا ہے..... گجر سے گاجر بنا دیا ہے..... میں تو کہتا ہوں بھاگ چلو یہاں سے کہیں یہ ہمیں مولی نہ بنا دے!!"

بڑے بزدل ہو ماٹے! بس ایک لڑکے سے ڈر گئے!"

"ہم تو تمہیں ایسا ڈرپوک نہیں سمجھتے تھے!!" گجر کے ساتھی ماٹے سے بولے۔

ماٹے نے کہا۔ "مجھے ماٹا نہ کہو مولی بدمعاش کہو..... لل..... لل..... لیکن میں بھلا مولی بدمعاش کیوں ہونے لگا؟" ایک بدمعاش نے غراتے ہوئے کہا۔ "چاہے مولی بدمعاش بنو یا مالٹا لیکن تم اب ہمارے ساتھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے میں تمہارا ساتھی نہیں لیکن مولی اور مالٹا بھی نہیں اب میں صرف مرغا بدمعاش ہوں۔ کیونکہ یہ استاد گاجر کا حکم ہے۔" یہ کہتے ہوئے ماٹے نے چاقو ایک طرف پھینک دیا۔ پھر مُرغے کی طرح اکڑوں ہو کر کان پکڑ لئے اور زور زور سے اذان دینے لگا۔

"ککڑوں کوں ...... ککڑوں کوں ......"

"ہوٹل میں موجود لوگ یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑے خود ماٹے کے ساتھی بدمعاش اس منظر کو دیکھ کر بھونچکارہ گئے۔ ایک جس کا دماغ خاصا گرم تھا یہ دیکھ کر آگے بڑھا اور غصے سے ایک زوردار لات ماٹے کی کمر پر رسید کی۔ لات کھا کر ماٹا مرغے کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا پکے فرش پر جا گرا اور اس کی ککڑوں کوں ادھوری رہ گئی۔

جواد نے اسی وقت ماٹے کے دماغ کو آزاد کر دیا اور گرم دماغ والے کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس نے اس کے دماغ کو ایک جھٹکا پہنچایا تو وہ چیخ اٹھا جواد نے اسے مرغا بنایا اور وہ اپنے منہ سے ککڑوں کوں کی آوازیں نکالنے لگا۔ پھر اذان دیتے ہوئے اس بدمعاش نے کہا۔ "استاد ماٹے! تم اکیلے ہی مرغا بدمعاش بنتے اچھے نہیں لگ رہے تھے اس لئے تمہارا ساتھ دینے آگیا ہوں آؤ میرے ساتھ مرغا بن جاؤ لات تو میں نے تمہیں پیار میں رسید کی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ زور زور سے مرغے کی طرح چلانے لگا۔ "ککڑوں کوں ...... ککڑوں کوں............"

ماٹے پکے فرش پر گرا اپنی چوٹوں کو سہلا رہا تھا اور خوف کے عالم میں جواد کو دیکھ رہا تھا اس نے جب یہ سنا تو سب کچھ بھول بھال کر فرش سے اٹھا اور تقریباً بھاگتا ہوا اپنے ساتھی کے برابر پہنچ کر مرغا بن گیا۔

تیسرا بدمعاش اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ چاقو ہاتھ میں پکڑے جواد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جواد کی آنکھوں پر کالا چشمہ لگا ہوا تھا اور آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن بدمعاش کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دو آنکھیں اس کی روح میں جھانک رہی ہوں۔ اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر بدمعاش کی ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ہاتھوں پر لرزہ طاری تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا اور وہ چیخیں مارتا ہوا اپنے ساتھیوں کے برابر جا کھڑا ہوا پھر کان پکڑ کر مرغا بن گیا۔ اب بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ تینوں بدمعاش مرغا بنے زور زور سے اذانیں دے رہے تھے جب کہ ہوٹل میں موجود لوگ پیٹ پکڑ کر ہنس رہے تھے۔ ایسا منظر انہوں نے اپنی زندگی میں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ لوگوں کی تو آنکھوں سے ہنستے ہنستے پانی نکل آیا تھا۔

پھر ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے جواد سے ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "یقین نہیں آتا تم نے بیٹھے بٹھائے ان بدمعاشوں کا کیا حال کر دیا ہے کیا تم سامری جادوگر کے کوئی رشتہ دار ہو؟"

بھائی! بدمعاشوں کو قابو کرنے والا کوئی منتر ہمیں بھی بتاؤ۔" مجمع میں سے ایک اور شخص نے آگے بڑھ کر جواد سے کہا تو جواد ہولے سے مسکرایا۔ اس وقت وہ گرم دماغ والے بدمعاش کے دماغ میں تھا۔ لوگوں کے پے در پے سوالات سن کر اس نے گرم دماغ والے کو کھڑا کیا اور اسی

کے لہجے میں چیخ کر کہا۔

"سامری جادوگر یہ نہیں میں ہوں۔ ادھر آؤ میں بتاتا ہوں تمہیں منتر مجھ سے سنو!" اتنا کہہ کر وہ ترنّم سے گانے لگا۔

"گجر بھگوڑی ماتھا پھوڑی
مُرغا بنا کر ہم کو چھوڑی
دس دس جوتے سب کو لگوڑی
درم پٹ ..... درم پٹ
ٹھوں ٹھوں ..... ٹھاں ٹھاں"

اس بدمعاش کے منہ سے یہ منتر سن کر لوگوں کے قہقہے چھوٹ گئے۔ لوگوں کو ہنستا دیکھ کر اس بدمعاش نے برا سامنہ بنا کر پھر چیخ کر کہا۔ "یہ کیا پاگلوں کی طرح ہنس رہے ہو میں نے بدمعاشوں کو قابو کرنے والا منتر سنایا ہے کوئی لطیفہ نہیں۔"

وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر دوسرے ہی لمحے چلّا کر بولا۔ "میں دوبارہ مرغا بن رہا ہوں ادھر آؤ اور ہم تینوں مرغ بدمعاشوں کو یہ منتر پڑھ کر دس دس جوتے لگاؤ آپ لوگوں کے دس دس جوتے لگیں گے تو ہماری بدمعاشی چھوٹ جائے گی۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنے کان پکڑے اور پھر مرغا بن گیا پھر مگڑوں کوں کا زور دار نعرہ مار کر بولا۔ "آؤ بھئی آؤ منتر پڑھ کر جوتے لگاؤ اور ہاں ذرا کس کس کے جوتے رسید کرنا۔" اس بدمعاش کے یہ جملے سن کر لوگ جو پیٹ پکڑ کر بری طرح ہنس رہے تھے، آگے بڑھے اور دل کھول کر ان بدمعاشوں کو کس کس کر جوتے رسید کئے۔ بہت سے منچلے نوجوانوں نے دس کی جگہ بیس جوتے لگائے۔

بدمعاش جو خوف و دہشت سے پہلے ہی ادھ مرے ہو رہے تھے لوگوں کے جوتے کھا کر مرغوں سے مرے ہوئے چوہے بن گئے۔ جیسے ہی بدمعاش لوگوں کے جوتے کھا کر نیچے گرے ہوٹل کے باہر سائرن بجنے کا شور سنائی دیا پھر کسی نے چیخ کر بتایا۔

"پولیس کی گاڑیاں آرہی ہیں۔" یہ سن کر جواد کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس کا یہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ پولیس کے آنے سے پہلے وہ ہوٹل سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن لوگوں کا جم غفیر اس کی طرف کھنچا چلا آرہا تھا۔ جواد نے ایک لمحے کو مجمع کی طرف دیکھا پھر دوسرے ہی لمحے اس نوجوان کے دماغ پر قابض ہو گیا جس نے اسے سامری جادوگر کا رشتہ دار کہا تھا۔ جواد نے اس نوجوان کا چہرہ اچانک مجمع کی طرف گھمایا اور پھر اسی کے لہجے میں چیخ کر کہا۔ "ارے بے وقوفو! پولیس آرہی ہے بھاگو یہاں سے ورنہ بدمعاشوں کے خلاف گواہی دینی پڑے گی۔ کورٹ کچہریوں کے چکر لگانے پڑیں گے۔" نوجوان اتنا کہہ کر خاموش ہوا پھر جھک کر اس نے اپنے پیروں سے جوتیاں نکال کر ہاتھ میں پکڑیں اور "بھاگو بھاگو" کا شور مچاتا ہوا ہوٹل سے بھاگ کھڑا ہوا۔ نوجوان کی بات سن کر اور اسے بھاگتا دیکھ کر لوگ بھی ہوٹل سے کھسکنے لگے۔ جواد نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور بڑی تیزی سے خود بھی ہوٹل سے باہر آگیا۔ سامنے روڈ پر گاڑیاں دوڑ رہی تھیں ایک

کوچ سامنے سے گزری تو جواد نے اسے رُکنے کا اشارہ کیا۔ کوچ کے بریک چرچرائے اور کوچ ترچھی ہو کر رک گئی۔ جواد دوڑتا ہوا کوچ تک پہنچا اور اس میں سوار ہو گیا۔

ہیٹ والا بھی بھاگتا ہوا ہوٹل سے باہر آیا لیکن کوچ آگے نکل گئی۔ وہ جاتی ہوئی کوچ کی طرف اس طرح سے دیکھنے لگا جیسے ہاتھوں سے کوئی اہم چیز نکل گئی ہو۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات اُبھر آئے تھے لیکن پھر ایک دم سے اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی جب اس نے ایک سفید کار کو بڑی تیزی سے اپنے قریب آتا دیکھا۔ کار اس کے قریب آ کر رکی۔ اس میں دو گنجے سوار تھے۔ ایک پچھلی سیٹ پر براجمان تھا جبکہ دوسرا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ کار کے رُکتے ہی کار کا اگلا دروازہ کھُلا اور پُراسرار ہیٹ والا جلدی سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔

"مہمان کہاں ہے؟" گنجے نے پوچھا۔ ہیٹ والے نے ونڈ اسکرین کے سامنے دور جاتی ہوئی کوچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں ..... کوچ میں ..... پیچھا کرو۔" ہیٹ والے کی یہ بات سنتے ہی گنجے نے بڑی تیزی سے کار آگے بڑھا دی۔ گاڑی کی رفتار تیز کرنے کے لئے اس نے بڑی جلدی جلدی گیئر بھی بدلے۔ "آرام سے ..... مہمان کو شک نہ ہو کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔" ہیٹ والے نے گنجے سے کہا اور گنجے نے گاڑی کی رفتار نارمل کر لی لیکن اس کی نگاہ بدستور کوچ پر لگی ہوئی تھی جو چار پانچ گاڑیوں کے آگے دوڑ رہی تھی۔

کوچ میں رش نہیں تھا۔ جواد کو آرام سے سیٹ مل گئی تھی۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

اس نے گجر بدمعاش اور اس کے ساتھیوں کا جو مضحکہ خیز حشر کیا تھا اسے یاد کر کے اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی دوڑنے لگی۔ ان بدمعاشوں کے اختتامی حالات جاننے کے لئے جواد نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی سوچ کی لہریں اس ملازم کے دماغ میں پہنچا دیں جس نے اس سے کھانے کا آرڈر لیا تھا۔ جواد نے ملازم کی آنکھوں سے دیکھا۔ پولیس کے سپاہی بدمعاشوں کو ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے گاڑی میں بٹھا رہے تھے۔ ان کا آفیسر بدمعاشوں کی حالت دیکھ کر سخت حیران تھا۔ اسے پتا چلا تھا کہ ایک نوجوان نے بغیر لڑے بھڑے ان بدمعاشوں کی یہ حالت کی ہے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ سوچ رہا تھا۔ "خیر تھانے جا کر یہ بدمعاش خود ہی بتا دیں گے۔"

"ٹکٹ لے لو باؤ جی!" جواد نے یہ آواز سن کر آنکھیں کھول دیں اور دماغی طور پر گاڑی میں حاضر ہو گیا۔ اس کے سامنے کوچ کا کنڈیکٹر ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ جواد نے اس کے ہاتھ میں دس کا نوٹ تھما دیا۔ وہ پوچھنے لگا۔ "کہاں جاؤ گے باؤ جی؟"

"جہاں قسمت لے جائے۔" جواد نے دھیرے سے کہا لیکن کنڈیکٹر نے سن لیا کہنے لگا۔

"باؤ جی گاڑی قسمت نگر نہیں جائے گی۔"

"چلو میں آخری اسٹاپ اتر جاؤں گا۔" جواد نے جلدی سے کہا۔ یہ سن کر کنڈیکٹر نے مطلوبہ پیسے کاٹے اور بقایہ جواد کو واپس کر دیئے۔

کنڈیکٹر کے جانے کے بعد جواد کو اچانک اس بچے کا خیال آیا جسے اس نے جلتی ہوئی عمارت سے نکالا تھا۔ جواد نے آنکھیں بند کر کے بچے کے لب ولہجے کو یاد کیا اور اس کا لب ولہجہ یاد آتے ہی جواد کی سوچ کی لہریں اس کے دماغ میں پہنچ گئیں۔ بچہ اس وقت ایک ہسپتال کے کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی ماں اس کے ننھے ننھے ہاتھ تھام کر بیٹھی تھی۔ بچہ اس وقت پوری طرح ہوش میں تھا اور بغیر کامے فل اسٹاپ کے ماں سے باتیں کر رہا تھا۔ جواد اس کے دماغ میں بیٹھ کر چُپ چاپ اس کی باتیں سُننے لگا۔ بچہ کہہ رہا تھا۔

"امی میں تو ڈر گیا تھا جب میں سو کر اٹھا تو کمرے میں اتنی ساری آگ تھی اور اتنی گرم تھی ..... میں بتا نہیں سکتا۔ میں سمجھا شاید میں دوزخ میں آگیا ہوں پھر میں نے اٹھ کر دروازے کو کھولنا چاہا لیکن دروازہ نہیں کھلا میں مدد کے لئے چلّانے لگا میری ناک میں کالا کالا دھواں گھس رہا تھا سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا پھر اچانک دروازے پر کوئی آگیا اور مجھے آواز دینے لگا۔ گڈو گڈو..... میں آواز کو سن تو رہا تھا لیکن جواب نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میں فرش پر گر گیا تھا۔ دھوئیں سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ پھر مجھے آواز دینے والا دروازے کو زور زور سے دھکا دینے لگا لیکن شاید دروازہ اس سے بھی نہیں کُھل رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے کبھی اندھیرا آتا تھا اور کبھی روشنی پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے چاروں طرف آگ ہی آگ ہو اور کوئی مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اس آگ سے دور لے جا رہا ہو..... بچہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر دوسرے ہی لمحے وہ بولا۔ "میں تو کہوں گا وہ فرشتہ تھا جس نے مجھے بچایا۔"

"ماں نے یہ سن کر محبت سے بچے کا ماتھا چوما پھر پیار سے بولی۔ "ہاں بیٹا وہ فرشتہ ہی تھا۔ اللہ نے اسے تمہاری مدد کے لئے بھیجا تھا۔"

"امی جان! اچھے لوگوں کی اللہ مدد کرتا ہے ناں؟" بچے نے پوچھا۔

"ماں بولی۔ "ہاں بیٹا!"

"اور اچھے لوگ دوسروں کی مدد کرتے ہیں ناں؟"

"ہاں بیٹا!"

"ہوں ..... مجھے یاد آگیا..... کل جب میں اسکول سے آرہا تھا تو ایک بوڑھی عورت سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"نانی اماں..... آپ سڑک پار کرنا چاہتی ہیں۔" تو وہ کہنے لگیں۔ "ہاں بیٹا! کافی دیر ہو گئی کوئی مجھے سڑک پار نہیں کرا رہا۔" یہ سن کر مجھے بہت دکھ ہوا وہ نانی اماں بہت کمزور اور بوڑھی تھیں۔ بہت

آہستہ آہستہ چل رہی تھیں تب میں نے بہت آرام سے ان کا ہاتھ پکڑا اور انہیں سڑک پار کرائی۔ انہوں نے مجھے بہت ساری دعائیں دیں۔"

بچہ پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہوا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ پھر وہ دوبارہ بولا۔ "امی جان اچھے لوگ دعائیں لیں تو فرشتے ان کی مدد کرتے ہیں ناں؟"

"ہاں بیٹا اب تم آرام کرو بہت باتیں کرتے ہو دیکھو تمہاری سانس پھولنے لگی ہے۔"

بچہ چپ ہو گیا۔ اس کے دماغ میں بہت ساری سوچیں ابھر رہی تھیں معصوم معصوم سوچیں۔ جواد کو اس بچے پر بہت پیار آیا۔ بچے کے ذہن میں ایک سوال کھٹک رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا۔

"امی ایک سوال پوچھوں؟"

"بس بیٹا اب آرام کرو۔" ماں نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"بس ایک سوال..... آپ یہ بتائیں کہ اگر وہ فرشتہ تھا تو اس سے دروازہ کیوں نہیں کھل رہا تھا۔ فرشتے تو بند دروازہ کھول سکتے ہیں ناں امی؟"

بچے نے ماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"ماں لاجواب ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ فرشتے دروازہ کھول سکتے ہیں یا نہیں کیونکہ اس نے کبھی فرشتہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ بچے معصوم ہوتے ہیں..... وہ فرشتے دیکھ سکتے ہیں۔"

جواد بھی بچے کے اس سوال پر چونک اٹھا تھا۔ بچے کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بے حد ذہین بچہ ہے۔ جواد ابھی بچے کے سوال کا جواب سوچ ہی رہا تھا کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی جواد کو بچے کے دماغ سے نکل کر گاڑی میں حاضر ہونا پڑا۔ اس کی بند آنکھیں کھل گئی تھیں۔ بڑی زور کا جھٹکا تھا اور اس کا سر سامنے والی سیٹ سے جا ٹکرایا تھا.....!!!

اس سنسنی خیز کہانی کے مزید دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں!!

جاری ہے.....

حیرت انگیز

چین کا ایک نامور مصور بانگ ارنان انتہائی باکمال مصور تھا وہ زبان سے تصویریں بناتا تھا وہ اپنے منہ کو ٹیوب اور زبان کو برش کی طرح استعمال کرتا تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ رنگوں کا ذائقہ محسوس کر کے مصوری کرنے کا بے حد شوقین ہے۔

مرسلہ..... عبدالباسط، ہری پور

قابل رشک

نیگور کو بچپن میں لڑکیوں پر بڑا رشک آتا تھا۔

"ہائے لڑکی ہونا کتنی اعلیٰ بات ہے۔"

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں لڑکیوں کو اسکول نہیں جانا پڑتا تھا۔

مرسلہ:۔ عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ۔

UNITED
PID-I-32 94

روشنی

ایک دفعہ شیخ سعدیؒ کسی جنگل سے گزر رہے تھے کہ انہیں ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک نونہال سجدے میں گرا رو رہا ہے۔ شیخ سعدیؒ نے اس سے پوچھا۔ "تو کون ہے؟" اس نے جواب نہ دیا تو شیخ سعدیؒ نے دوسری اور پھر تیسری بار پوچھا تو لڑکے نے کہا۔ "تم کون ہو میری عبادت میں خلل ڈالنے والے؟" آپ نے پھر پوچھا "تیرا استاد کون ہے۔ جس نے تیری اتنی اچھی تربیت کی ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "میرا استاد میری ماں ہے۔ وہ ایک دن چولہے میں لکڑیاں جلا رہی تھی۔ جو بہت بڑی بڑی تھیں اور وہ آگ نہیں پکڑ رہی تھیں پھر میری ماں نے چھوٹی لکڑیاں ڈالیں تو انہوں نے فوراً آگ پکڑ لی جس کی وجہ سے بڑی لکڑیاں بھی جلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ قیامت کے دن فرعون اور نمرود جیسے گناہ گاروں کو آگ میں جلانے سے پہلے ہم جیسے چھوٹے چھوٹے گناہ گاروں کو جلایا جائے گا۔ بس جبھی سے اللہ تعالیٰ سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں۔

مرسلہ..... مختار حسین ہاشمی

فیصلہ

گلستان سعدی سے انتخاب

ضیاء الرحمٰن مروت، ترخیل لکی

ایک شخص کُشتی لڑنے کے فن میں بہت ماہر تھا اور تین سو ساٹھ عمدہ داؤ جانتا تھا۔ اس کے بہت سے شاگرد بھی تھے جنہیں وہ کشتی کے داؤ پیچ سکھاتا رہتا تھا لیکن ایک شاگرد کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا اس نے اپنے اس شاگرد کو تین سو انسٹھ داؤ سکھا دیئے مگر ایک داؤ کے سکھانے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ نوجوان طاقت اور کُشتی کے فن میں بہت ماہر ہو گیا اور اس وقت کسی کو اس کے ساتھ مقابلے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

یہاں تک کہ ایک دن اس نے بادشاہ کے سامنے کہہ دیا۔ "استاد کو مجھ پر بزرگی اور تربیت کے حق کی وجہ سے برتری ہے ورنہ طاقت میں میں اس سے کم نہیں ہوں۔" بادشاہ کو یہ بات ناگوار گزری۔ بادشاہ نے کُشتی لڑنے کا حکم دیا۔ ایک بہت وسیع میدان ترتیب دیا گیا اور سلطنت کے عہدے دار دربار کے امرا اور مملکت کے پہلوان حاضر ہوئے۔ نوجوان مست ہاتھی کی طرح نکلا۔ اس زور سے جھومتا ہوا کہ اگر فولاد کا پہاڑ ہوتا تو اسے اپنی جگہ سے اکھیڑ دیتا۔ استاد جان گیا کہ نوجوان قوت میں اس سے زیادہ ہے۔ پس اس عجیب و غریب داؤ سے جو اس نے نوجوان سے پوشیدہ رکھا تھا اس ..... پر آزمایا۔

نوجوان شاگرد اس کا توڑ نہیں جانتا تھا۔ استاد دونوں ہاتھوں سے اس کو اٹھا کر سر تک لے گیا، اور زمین پر گرا دیا۔ لوگوں میں شور بلند ہوا اور بادشاہ نے استاد کے لئے شاہی لباس اور انعام کا حکم

دیا اور اس لڑکے کو برا بھلا کہا کہ تو نے اپنے استاد کی برابری کا دعویٰ کیا اور اسے پورا نہ کیا۔

نوجوان نے کہا۔ اے باشادہ! میرا استاد طاقت کے بل بوتے پر مجھ پر غالب نہیں آیا۔ بلکہ کشتی کے فن میں ایک باریکی (ایک داؤ) مجھ سے رہ گئی تھی۔ جس کے سکھانے میں وہ ٹال مٹول کرتا تھا۔ آج اس باریکی (داؤ) کی وجہ سے مجھ پر غالب آیا۔ استاد نے کہا کہ اس داؤ کو ایسے ہی دن کے لئے میں تجھ سے چھپاتا رہا تھا۔ کیونکہ دانا وں نے کہا ہے کہ دوست کو اتنی طاقت نہ دو کہ اگر دشمنی کرنا چاہے تو تمہیں تکلیف پہنچا سکے۔

ہمیں کون ہیں؟

یہ تصویر ایک مشہور شخصیت کی ہے۔ آپ کو یہ کرنا ہے کہ اس شخصیت کا نام اور کس حوالے سے یہ شخصیت مشہور ہے، بتانا ہے..... تو اٹھایئے کاغذ قلم اور لکھ بھیجئے ہمیں درست جواب۔

اپنے جوابات اس پتے پر ارسال کیجئے۔ "میں کون ہوں؟" ماہنامہ آنکھ مچولی، اے پی آئی بی کالونی، کراچی۔۔۔۔ پوسٹ کوڈ ۷۴۸۰۰

انعام پایئے۔

اپنی ذہانت کو ان سوالوں کی کسوٹی پر پرکھیے

مرسلہ محمد ابراہیم خان، کراچی۔

۱ دو باتیں ایسی ہیں جنہیں سیکھنے کے لئے دنیا کی کسی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

۲ وہ کیا ہے جو ماں باپ میں ملتا ہے اولاد میں نہیں ملتا؟

۳ وہ کون سی جگہ ہے جہاں اتوار سے پہلے ہفتہ آتا ہے؟

۴ رکشا کے آگے موٹر کے پیچھے اور ٹرک کے بیچ میں کیا ہوتا ہے؟

منزل دے کہاں میری

سید نوید احمد، کراچی۔

ایک ملک کے راجہ کی کہانی جسے مہنگائی نے مار دیا.....!!

راجہ گورنمنٹ اسکول میں پڑھتا تھا جس کی ماہانہ فیس ایک سو روپے تھی۔ پہلی سے لے کر دوسری جماعت تک کے بچوں کو یہ فیس ادا کرنی پڑتی تھی۔ راجہ کے پاس بہت ساری کتابیں تھیں کچھ اس نے ردی سے خریدی تھیں اور کچھ باہر سے منگوائی تھیں۔ اس کا بستہ بہت وزنی تھا۔ راجہ کا پروگرام تھا کہ جب وہ پڑھ لکھ کر بڑا ہو گا تو ویٹ لفٹر بنے گا۔

راجہ کے محلے میں بہت سے ایسے فقیر تھے جو ملک کے بڑے بڑے وزیر تھے لیکن ان کی مانگنے کی عادت وزیر بن کر بھی ختم نہ ہوئی تھی۔ وہ حکومت سے پلاٹ پرمٹ کاریں، پجیرو اور باہر ملک علاج کے لئے ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور پیسے مانگتے تھے۔ حکومت ان کو یہ سب فراہم کرتی تھی کیوں کہ وہ ان سے حکومت چلاتی تھی۔ حکومت کے خزانے میں پیسہ کبھی ختم نہیں ہوتا تھا کیوں کہ ہر مہینے حکومت اپنے ملک کے عوام پر نئے نئے ٹیکس لگا دیا کرتی تھی۔ حکومت کا کہنا تھا کہ عوام کے جسموں میں بہت خون ہے جس کی وجہ سے وہ کاہل اور کام چور ہو گئے ہیں۔ حکومت فاطمید بلڈ ٹرانسفیوژن کی طرح ان کے جسموں سے خون نچوڑنا چاہتی تھی اس لئے ہر مہینے وہ مہنگائی بڑھا دیتی تھی پھر ہر چھ مہینے بعد ایک بھاری بھر کم بجٹ عوام پر

لاد دیتی تھی۔ خاص کر اسے غریب عوام کا خون بہت اچھا لگتا تھا۔

راجہ کو اپنی حکومت سے سخت نفرت تھی کیوں کہ حکومت عوام کی دوست نہیں دشمن تھی۔ اس کے وزیر بڑی بڑی ایئر کنڈیشنر گاڑیوں میں گھومتے تھے جب کہ عوام کے لئے ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کا فقدان تھا۔ وزیروں کا پینے کا پانی باہر ملکوں سے آتا تھا جب کہ عوام کو اپنے ہی وطن میں پینے کا صاف پانی میسّر نہ تھا۔

روٹی کے بجائے حکومت انہیں گولی دیتی تھی جس سے وہ چین کی نیند سو جاتے تھے۔ راجہ کے ملک میں چوروں، ڈاکوؤں، لٹیروں کا دور دورہ تھا۔ حکومت سے ان کے خاصے اچھے تعلقات تھے۔ جو چور چوری سے توبہ کر لیتا تھا وہ حکومت کا وزیر یا مشیر بن جاتا تھا اور اس کی ترقی ہو جاتی تھی۔

راجہ اپنے ملک کے عوام کی طرح مہنگائی سے سخت تنگ آیا ہوا تھا۔ اس کے محلے میں کتنے ہی گھر ایسے تھے جہاں ایک وقت کا کھانا بھی بڑی مشکل سے کھایا جاتا تھا۔ راجہ کے ابو کا خود کہنا تھا کہ وہ اسے ایک مہینے بعد اسکول سے اُٹھا لیں گے کیوں کہ وہ اب ہر مہینے اس کی فیس کے پیسے ادا نہیں کر سکتے۔

راجہ حکومت کے خلاف تحریک چلانا چاہتا تھا لیکن وہ ابھی بہت چھوٹا تھا۔ بڑے بڑے لوگ تحریک چلاتے ہوئے ڈرتے تھے کیوں حکومت بے گناہ لوگوں کو جیل میں بند کر دیتی تھی.....

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور مہنگائی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا..... حکومت اور اس کے وزیر عیش و عشرت میں پڑے ہوئے تھے اور ملک کے عوام مہنگائی اور غربت کے بوجھ تلے کچلتے جا رہے تھے پھر ایک وقت ایسا آیا کہ لوگوں کو روٹی کھانا مشکل ہو گیا کیونکہ وہی روٹی جو ایک روپیہ میں آتی تھی اب پچاس روپے کی ہو گئی تھی..... اور پھر ایک دن دنیا کے تمام اخبارات میں جلی سرخیوں میں یہ خبر لگی "اندھیر نگری چوپٹ راج کے عوام مہنگائی کے ہاتھوں مارے گئے۔" اس خبر کے نیچے مرے ہوئے لوگوں کی تصویریں تھیں جن میں راجہ کی تصویر سب سے نمایاں تھی.....!!!

کہانی یہاں پر آ کر ختم ہو گئی تھی۔ ایڈیٹر صاحب نے کہانی پڑھنے کے بعد ناک پر سے چشمہ ہٹایا پھر کہانی کو مروڑ تروڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا کیوں کہ اس کہانی میں ان کے ملک کا نقشہ کھینچا گیا تھا.....!!

نومیر کی بلاعنوان کہانی کا نتیجہ

ایسا کیوں ہوتا ہے ـــــ صدف مظفر

تابش بے چارہ ـــــ مشتاق حسین راتا

ابو اچھے نہیں ـــــ ہما صابر

سمیع اللہ کے خوب صورت کراس پر ان کے فارورڈ کا شاندار گول۔

فلائنگ ہارس

تحریر: عمران خالق

سمیع اللہ نے ۶ ستمبر ۱۹۶۱ء کو بہاولپور کے ایک گھر میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم وہیں کے ایک اسکول سے حاصل کی۔ کچھ بڑے ہوئے تو ہاکی کھیلنے کا شوق ہوا۔ اور وہ ہاکی کھیلنے لگے ان میں ہاکی کے کھیل کھیلنے کی خداداد صلاحیتیں موجود تھیں جس کی وجہ سے ان کے کھیل میں نکھار آتا رہا اور ۱۸ سال کی عمر میں پہنچنے تک وہ مغربی پاکستان یوتھ ٹیم میں شامل ہو گئے۔ یوتھ ٹیم کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں انہوں نے سری لنکا کا دورہ کیا۔ اور عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ جس کی وجہ سے ان کو پاکستان انٹرنیشنل ائیر لائین کی ہاکی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ لیکن پھر ۱۹۷۲ء میں وہ پی آئی اے کی ٹیم چھوڑ کر پاکستان کسٹمز کی ٹیم میں شامل ہو گئے۔

۱۹۷۳ء کا سال سمیع اللہ کے لئے خوشیوں کا سال ثابت ہوا اور اسی سال ان کو ان کی محنت کا ثمر ملا اور انہیں قومی ہاکی ٹیم میں بطور لیفٹ آؤٹ شامل کر لیا گیا۔

سمیع اللہ نے پاکستانی ہاکی ٹیم کی جانب سے تین عالمی کپ ہاکی مقابلوں میں حصہ لیا۔ ان مقابلوں میں عمدہ کھیل کا مظاہرہ کرنے کی وجہ سے سمیع اللہ کو "ڈینجرمین" کا خطاب ملا۔ ۱۹۸۳ء میں سمیع اللہ نے (جب وہ ہاکی ٹیم کے کپتان تھے) ہاکی سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا اور اس طرح اس عظیم کھلاڑی نے اپنے عروج کے دور میں ہاکی کو خیرباد کہہ دیا۔

آجکل پاکستانی ہاکی ٹیم کی کارکردگی شاندار ہے۔ حال ہی میں آسٹریلیا (سڈنی) میں ہونے والے ورلڈ کپ میں پاکستانی ہاکی ٹیم نے نہایت شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا اور ورلڈ کپ ایک سنسنی خیز مقابلہ کے بعد جیت لیا ہے۔

علی اعجاز، کراچی۔

ایک تھے جھگڑالو میاں

ایک گاؤں میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ وہ بہت بدتمیز، منہ پھٹ اور جھگڑالو تھا اس کا نام محلے والوں نے اس لئے جھگڑالو میاں رکھا ہوا تھا۔ سارے محلے والے اس کی بدتمیزیوں اور جھگڑوں سے تنگ تھے۔ ماں باپ اس کو بہت سمجھاتے کہ ایسا مت کرو مگر وہ ان کی بات کو اس کان سنتا اور اس کان اڑا دیتا۔

ایک دن جھگڑالو میاں اسکول سے آرہے تھے کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک بڑھیا پر نظر پڑی جو لنگڑا کر چل رہی تھی۔ جھگڑالو میاں کو شرارت سوجھی وہ بڑھیا کے قریب گئے اور اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ بے چاری زمین پر گر پڑی۔ اس کے سخت چوٹ آئی۔ بڑھیا زمین پر پڑی تکلیف سے کراہ رہی تھی اور جھگڑالو میاں کو بد دعائیں دے رہی تھی۔

اس تکلیف دہ بات کو کئی مہینے گزر گئے۔ ایک دن جھگڑالو میاں اچھلتے کودتے، سیٹیاں بجاتے اسکول سے آرہے تھے کہ ایک موڑ پر تیز رفتار کار نے انہیں بری طرح ٹکر مار دی۔ وہ بے ہوش ہو گئے۔ ان کا سارا بدن زخموں سے چور ہو گیا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ لوگوں نے انہیں جلدی جلدی ہسپتال پہنچایا۔ ان کے والدین کو پتا چلا تو وہ بھی بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے اور ان کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ ڈاکٹروں نے جھگڑالو میاں کے کئی آپریشن کئے۔ ان کی ایک ٹانگ اس بری طرح کچلی گئی تھی کہ ڈاکٹروں کو مجبوری میں اسے کاٹنا پڑا۔ جھگڑالو میاں کئی دن بے ہوش رہے۔ جب انہیں ہوش آیا تو پتا چلا کہ ان کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی ہے۔ وہ بہت روئے انہیں یاد آیا کہ انہوں نے ایک لنگڑی بڑھیا کو دھکا دیا تھا اور اس نے انہیں خوب بد دعائیں دی تھی۔ اسی بڑھیا کی آہ انہیں لگ چکی تھی۔ اب وہ نہ بھاگ دوڑ سکتے اور نہ صحیح طریقے سے چل سکتے تھے۔ مصنوعی ٹانگ کے ساتھ بیساکھیوں کے سہارے وہ آہستہ آہستہ چل کر اسکول پہنچتے ہیں۔ اب وہ زیادہ تر خاموش رہتے ہیں۔ اللہ سے توبہ کرتے ہیں اور ہر وقت پڑھنے میں لگے رہتے ہیں۔

دوسروں کو ستانے والے کو کوئی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا اور انہیں دنیا میں ہی سزا مل جاتی ہے چاہے جلدی ملے یا دیر سے.....!!

بلا عنوان

نام بھی انعام بھی

اس بلا عنوان کہانی کو آنکھ مچولی کے ایک مشہور مصنف نے قلم دوست (نئے لکھنے والے) ساتھیوں کے لئے بطور خاص تحریر کیا ہے۔ ان کی دلچسپ تحریریں آنکھ مچولی میں اکثر و بیشتر چھپتی رہتی ہیں۔ آپ کو اس کہانی کا عنوان منتخب کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مصنف کا نام بھی بتانا ہے..... نیز وہ ترکیب بھی بتانی ہے جو نوید نے مصنف کو بتائی تھی۔ (یہ ترکیب بہت آسان ہے اور ترکیب پر عمل کرتے ہوئے اس مصنف کی کہانیاں بچوں کے رسالوں میں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہیں۔)

بالکل درست جواب لکھنے والے ساتھی کو آنکھ مچولی چھ ماہ کے لئے اعزازی روانہ کیا جائے گا۔ اپنے جوابات اس پتے پر ارسال کریں قلم دوست، ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔پی آئی بی کالونی، کراچی پوسٹ کوڈ / ۷۴۸۰۰

میز پر بچوں کے ایک مقبول رسالے کے ایڈیٹر صاحب کا خط رکھا ہوا تھا۔ یہ خط دراصل ہمارے جوابی لفافے میں آیا تھا جو ہم نے کہانی کے ساتھ بھیجا تھا۔ ایڈیٹر صاحب نے اتنا کرم کیا کہ خط تو لکھ دیا، مگر کہانی ردی کی ٹوکری کی نذر کر دی تھی اور خط لکھا بھی تو کیسا۔ انتہائی بور اور نصیحت آمیز لیکچر کے ساتھ۔ یہ ہم سے کس طرح ہو سکتا تھا کہ خط پورا پڑھ لیتے۔ اگر ہم گھر والوں کے لیکچر سننے کی قوت رکھتے تو آج امی جان کے منظور نظر نہ ہوتے؟ اس وقت ہمارا غصہ اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا جو کہ بالکل بجا تھا۔ ایک دو نہیں پورے چھ مرتبہ اپنے پسندیدہ رسالے میں کہانیاں بھیجیں اور چھ کی چھ مرتبہ انتہائی مایوس کن جواب ملا۔ "حد ہو گئی..... کوئی شرافت ہے..... ایڈیٹر صاحب تو ہمیں فرعون کے رشتہ دار لگتے ہیں۔" ہم غصے سے بڑبڑائے۔

"کیا بات ہے بھئی! یہ بڈھوں کی طرح کیوں بڑبڑا رہے ہو؟" ہمارا دوست نوید کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"تم کب آئے یہاں؟" ہم نے اسے حیرت سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہارے ساتھ لائبریری چلنے کے لئے آیا تھا۔ مین گیٹ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو تمہارے بڑبڑانے کی آواز آئی اور پھر میں اس کمرے میں آ گیا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"اچھا ایک بات تو بتاؤ یار!" ہم نے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں پوچھو۔" وہ بولا۔

"تمہیں معلوم ہے یہ ایڈیٹر صاحبان کس قسم کے مصنفین کی کہانیاں شائع کرتے ہیں؟"

"اپنے رشتہ داروں کی۔"

"کیا مطلب؟" ہم نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ وہ اپنے عزیز و اقارب کی کہانیاں زیادہ شائع کرتے ہیں اس طرح ان کے رشتہ دار..... لکھنے والوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ لہٰذا کسی اور "ایرے غیرے نتھو خیرے" کے لکھنے کے لئے جگہ ہی نہیں رہتی۔" ہم کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے تو نہیں تھے پھر بھی ہم نے نوید سے پوچھا۔

"تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ سارے لکھنے والے ایڈیٹر کے رشتہ دار ہوتے ہیں کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہوتے۔"

"اس لئے کہ یہ رسالہ جس پریس میں چھپتا ہے وہ میری امی کے خالو کا ہے۔

"تو کیا میرا پسندیدہ مصنف ذیشان ایڈیٹر کا رشتہ دار ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"ہاں، وہ ان کے ماموں زاد بھائی کے چچازاد بھائی کا رشتے میں بھانجا ہے۔"

"اور نیما صاحبہ بھی؟"

"ہاں وہ بھی۔ وہ ایڈیٹر صاحب کے والد کے ایک عزیز دوست کی نواسی ہیں۔"

"واہ! بڑے قریبی رشتے ہیں ان کے ایڈیٹر صاحب سے۔" ہم نے ہنس کر کہا۔ "اچھا کیا قمر صاحب بھی ان کے رشتہ دار ہیں؟"

"نہیں، ان کی تحریریں معیاری ہوتی ہیں۔"

"کیا تحریروں کا معیاری ہونا ضروری ہے؟"

"ہاں، ویسے رشتہ دار ہونا بھی بری بات نہیں۔" اس نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ....."

"یار، تم تو سوالات کر کر کے میرا ناک میں دم کر دو گے۔" وہ بات کاٹ کر بولا۔ "میں تم کو ایسی ترکیب بتا دیتا ہوں کہ تمہاری کہانی رسالے میں با آسانی چھپ جائے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک ایسی ترکیب بتائی جسے سن کر ہم اچھل ہی پڑے۔

ہم نے فوراً اس ترکیب پر عمل کرتے ہوئے ایک کہانی لکھی اور ایڈیٹر صاحب کو بھیج دی پھر اگلے ہی مہینے ہماری کہانی چھپ بھی گئی..... اب نوید نے ہمیں کیا ترکیب بتائی یہ ہم آپ کو نہیں بتائیں گے بلکہ آپ کو ہمیں بتانا ہوگا.....!!!

سیما عقیل الرحمٰن
حیدر آباد

غور کرنے کی بات ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنا کام وقت پر انجام دے رہا ہے۔ دن اور رات اپنے مقررّہ وقت پر آتے جاتے ہیں۔ سورج اپنے وقت پر طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ لہٰذا کائنات کا نظام بھی ہمیں وقت کی پابندی کا درس دیتا ہے۔

دُنیا کا کوئی بھی شخص جب تک وقت کی پابندی نہیں کرے گا۔ اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو گا۔

اب بات کرتے ہیں طالب علموں کی، طالب علموں کی اکثریت وقت کی پابندی نہیں کرتی، اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہئے کہ طالب علمی کا یہ دور جسے آپ کھیل کود اور بے کار مشغلوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ دوبارہ یہ وقت نہیں آسکتا۔

طالب علموں کی اکثریت سال کا بیشتر حصّہ کھیل کود اور فالتو کاموں میں ضائع کر دیتی ہے۔ اور جب امتحانات سر پر آجاتے ہیں تو طلبا پڑھائی میں دن رات ایک کر دیتے ہیں، یا پھر نقل کرنے کے نت نئے طریقے سوچتے ہیں۔

اور جو طالب علم نقل کرتے ہیں وہ اگر پکڑے جاتے ہیں تو اپنا پورا سال خراب کرتے ہیں اور اگر پاس بھی ہو جاتے ہیں تو یہ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ کیوں کہ انہیں پڑھنا تو آتا ہی نہیں ہے اور پول کو کبھی نہ کبھی تو کھلنا ہوتا ہی ہے۔ آج نہ سہی کل سہی۔ لہٰذا شرمندگی سے بچنے کی ایک آسان ترکیب یہ ہے کہ آپ وقت کی پابندی کیجئے۔

شروع سال سے ٹائم ٹیبل بنا کر پڑھائی کیجئے اور زیادہ وقت پڑھائی کو دیجئے۔ تھوڑا سا وقت کھیل کے لئے بھی نکالئے اور ہر کام وقت پر کیجئے کہ گیا وقت لوٹ کر نہیں آتا۔

"وقت۔" تین حروف پر مشتمل یہ چھوٹا سا لفظ انسان کی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتے ہیں جو وقت کا صحیح استعمال جانتے ہیں۔

وقت کی پابندی صرف طالب علموں کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو کوئی کام کرتا ہے۔

وقت کی پابندی کا مطلب صرف یہ ہی نہیں کہ انسان وقت پر اُٹھے، کھانا کھائے، اپنی ڈیوٹی انجام دے بلکہ انسان کو چاہئے کو جو فرصت اس وقت اسے حاصل ہے۔ اس سے کام لے کر ماضی کی غلطیوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اپنے حال اور مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔

یہ شعر مجھے پسند ہے

قارئین کے منتخب اشعار

کل دیکھا اک آدمی، اٹا سفر کی دُھول میں
گُم تھا اپنے آپ میں جیسے خوشبو پھول میں

مرسلہ..... محمد نعیم احمد کراچی

تیز تھی اتنی کہ سارا شہر سونا کر گئی
دیر تک بیٹھا رہا میں اس تیز ہوا کے سامنے

مرسلہ..... محمد ندیم، حیدر آباد

دیکھئے اب کے برس کیا گل کھلاتی ہے بہار
کتنی شدت سے مہکتا ہے گلستاں دیکھئے

مرسلہ..... محمد عرفان احمد، کراچی

بس ایک قدم اٹھا تھا غلط راہِ شوق میں
منزل تمام عمر مجھے ڈھونڈتی رہی

مرسلہ..... سعید احمد، کراچی

زر کے سائے میں جو پلتے ہیں، وفا کیا جانیں
دل بھی ان لوگوں کے سونے کے ہوا کرتے ہیں

مرسلہ: ظہیر احمد

نہ اُٹھا سکو گے آنسو جو گریں گے بے سہارے
کہیں زیست پا سکے ہیں کبھی ٹوٹ کر ستارے

مرسلہ..... افتخار عالم، کراچی

آیا ہی تھا ابھی میرے لب پہ وفا کا نام
کچھ دوستوں نے ہاتھ میں پتھر اُٹھا لئے

مرسلہ..... منور حسین رانا، اسلام آباد

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

مرسلہ: ذیشان رؤف

ہمدردیوں کی بھیک سی دینے لگے ہیں لوگ
یوں اپنے دل کا حال نہ سب سے کہا کرو

مرسلہ: محمد طیب مہدی

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

مرسلہ..... سیّد محمد اسامہ، راولپنڈی

نہ چین ظلمت کو لینے دینا، عدو کی نیندیں اڑائے رکھنا
چراغ ہر سو جلا چلے ہم، تم ان کو آگے جلائے رکھنا

مرسلہ..... ذکریٰ وحید سلیمانی، لاہور

اک بات ہوتی تو ٹل جاتے ہم سونے کی میزانوں میں
افسوس یہاں دو کوڑی میں انسان خریدے جاتے ہیں

مرسلہ..... صائمہ اکرم، رحیم یار خان

بہادو خون سڑکوں پر مگر اتنا تو سوچو تم
وطن جب خون مانگے گا تمہارے پاس کیا ہو گا

مرسلہ..... عشرت بانو، کراچی

آگہی میں اک خلا موجود ہے
اس کا مطلب ہے خدا موجود ہے

مرسلہ..... نایافت، کراچی

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی، صبح دوام زندگی

مرسلہ..... خوش بخت صوفیہ، ایبٹ آباد

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

مرسلہ..... آزاد راج کمار، کنڈھ کوٹ

محمد اجمل انصاری

اس طرح تو ہوتا ہے

پہلا ٹکڑا

میرے والد صاحب نے جب سے مجھے ایک اچھا سا کمپیوٹر کیا دلوا دیا تھا۔ میں سارا دن اس پر گیم کھیلتا رہتا، ہاں کبھی کبھی کہانی بھی پڑھتا اور لکھتا بھی۔ میری ایک کہانی حال ہی میں بچوں کے مقبول ماہنامے "کتابی دوست" میں چھپی اور میرا شمار زیادہ والے لوگوں میں ہونے لگا ہے کیونکہ ہمارے ملک میں پڑھنے والوں کی تعداد کم ہے اور لکھنے والوں کی زیادہ۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں اپنے دوست ظاہر بھگوڑی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا تھا، جب ظاہر بھگوڑی نے چائے پی لی تو اس نے کہا، "چلو آؤ کمپیوٹر میں اسٹریٹ فائٹر ڈبل میں کھیلتے ہیں میں نے بھی چائے پی لی تھی اس لئے ظاہر بھگوڑی کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا میں نے جا کر کمپیوٹر کو آن کیا تو اسکرین پر پتا نہیں کونسی زبان میں کچھ عبارت اُبھر آئی جسے میں پڑھ نہیں سکتا تھا میں نے ایک سیکنڈ کی دیر کئے بغیر ایک بٹن دبایا۔ وہ بٹن دبانے سے یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اسکرین پر ہو وہ ایک کاغذ پر اُتر کر آجاتا ہے۔ پانچ سیکنڈ کے بعد وہ اُلٹی سیدھی زبان میں لکھا ہوا پیغام غائب ہو گیا میں نے وہ کاغذ ظاہر کو دکھایا تو اس نے کہا "مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا ایسا کرو، میرے ابو کو دکھا دو شائد وہ بتا دیں۔" میں نے کہا "ہاں یہ ٹھیک ہے!" ظاہر بھگوڑی کے والد صاحب بہت سی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ میں نے ظاہر کے والد

صاحب کو وہ کاغذ دکھایا۔ انہوں نے کاغذ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا، "یہ تو کوڈ ورڈ ہیں۔۔۔۔ تمہیں کہاں سے ملا، یہ کاغذ؟" میں نے انہیں کاغذ ملنے کی کہانی سنا دی، انہوں نے تھوڑی دیر تک کاغذ کو بڑے غور سے دیکھا اور بولے اس میں کسی دوسرے سیارے کی زبان استعمال کی گئی ہے لیکن میں یہ زبان تھوڑی بہت جانتا ہوں۔ پھر انہوں نے ڈیڑھ گھنٹے کی مغزماری کے بعد اس کاغذ کا ترجمہ کیا جو کچھ یوں تھا: "ہم نے خفیہ طور پر اس دنیا کا معائنہ کیا ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ یہ دنیا ہم سے کروڑوں سال پیچھے ہے ہم اس پر آرام سے قبضہ کر سکتے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے اب آپ ہمیں جو حکم دیں گے ہم وہی کریں گے۔"

ظاہر کے والد (عبدالمجید) نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر کہا۔ "اس کا مطلب ہے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق زمین پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ اس نے زمین کے حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد اپنے سیارے کو زمین پر قبضہ کرنے کی دعوت دی ہے۔"

"اب کیا ہو گا ابو؟" ظاہر بھگوڑی نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"قبضہ ہو گا..... اس زمین پر کسی اور کا قبضہ ہو گا.....!!" ابو نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"پوری دنیا پر اور ..... اور "آریکا" پر بھی جس نے ہمارے ملک پر قبضہ کر رکھا ہے۔"

"ہاں آریکا پر بھی..... آریکا کے سائنس دان بھی اس سیارے کی مخلوق کے حملے سے نہیں بچ سکیں گے۔"

پھر تو بہت اچھا ہو گا ابو ..... مجھے آریکا سے سخت نفرت ہے۔ اس نے ہمارے ملک کے لوگوں کو آپس میں لڑوا دیا ہے اور اپنی فوجیں امن کے بہانے اتار دی ہیں، ہمارے ملک کے فوجیوں اور سیاستدانوں کو خرید رہا ہے اور اس نے ہمارے ملک میں مہنگائی کتنی بڑھا دی ہے۔ دال، آٹے چاول، مرچیں، گھی کھانے پینے کا سامان کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔" ظاہر بھگوڑی نے بڑے جوش سے کہا پھر اس نے اپنے ابو سے پوچھا۔

"ابو کیا دوسرے سیارے کی مخلوق زمین پر قبضہ کرنے کے بعد مہنگائی کا خاتمہ کر دے گی؟؟؟"

(جاری ہے)

تحائف

○ خانہ بدوش موسم کے حال کے بارے میں کبھی اخبار نہیں پڑتا اور اپنے ہاتھ نکال کر جان لیتا ہے کہ آج بارش اس کے خیمے پر برسے گی۔

○ بڑا بننے کے لئے چھوٹا ہونا پڑتا ہے۔

○ اگر کسی دن زندگی خوبصورت نہ لگے تو کسی چھوٹے بچے کو آئس کریم کھاتے ہوئے دیکھ لیں۔

مرسلہ: مولا بخش، کراچی

مچھّر

محمد عظیم قریشی، اسلام آباد

مچھر ہے وہ مچھّر ہے
جاتا سب کے گھر گھر ہے
پیں پیں کر کے آتا ہے
کان میں شور مچاتا ہے
ننّھی سی ہے اس کی جان
کتنا دیتی ہے نقصان
کاٹتا ہے یہ ہولے سے
بن جاتے ہیں اولے سے
دشمن ہے یہ ننھا سا
ڈنک ہے جس کا زہریلا
ٹانگیں لمبی لمبی ہیں
کیسی ٹیڑھی میڑھی ہیں
مچھر ہے وہ مچھّر ہے
جاتا سب کے گھر گھر ہے

مقابلہ کہانی نویسی

نئے لکھنے والوں کے لئے کہانی مقابلے کے ساتھ آنکھ مچولی حاضر ہے۔ اس مقابلہ کہانی نویسی کا عنوان ہے "مارگئی مہنگائی" اور "پاکستان خطرے میں ہے"۔ فل اسکیپ کے کم از کم دو صفحات پر ان موضوعات کو کہانی کی شکل دینی ہے۔

پانچ بہترین کہانیوں کو اشاعت کے لئے نہ صرف منتخب کیا جائے گا بلکہ انعام میں آنکھ مچولی کے خاص شمارے، رنگ برنگے اسٹیکرز کشمیری کہانیوں کا انتخاب اور معلوماتی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

آپ کی کہانیاں آسان زبان میں موجودہ مسائل اور ان کے حل کے حوالے سے ہونا ضروری ہیں...... تو پھر اٹھائیے کاغذ اور قلم اور لکھ ڈالیے لیکن ٹھہریئے........ کہانی لکھنے سے پہلے اس کی آخری تاریخ نوٹ کر لیجئے۔ کہانی کے وصولی کی آخری تاریخ ہے ۱۵ جنوری ۱۹۹۶ء۔

ہمارا پتا ہے:

مقابلہ کہانی نویسی
قلم دوست۔ ماہنامہ آنکھ مچولی
۱۔ پی آئی پی کالونی، کراچی
پوسٹ کوڈ ۷۴۸۰۰

ب کو وہ کاغذ دکھایا۔ انہوں نے کاغذ کو بغور
ے ہوئے کہا، "یہ تو کوڈ ورڈ ہیں۔۔۔۔ تمہیں کہاں
لا، یہ کاغذ؟" میں نے انہیں کاغذ ملنے کی
نا دی، انہوں نے تھوڑی دیر تک کاغذ کو
بڑے غور سے دیکھا اور بولے اس میں کسی
دوسرے سیارے کی زبان استعمال کی گئی ہے لیکن
میں یہ زبان تھوڑی بہت جانتا ہوں۔ پھر انہوں
نے ڈیڑھ گھنٹے کی مغزماری کے بعد اس کاغذ کا ترجمہ
کیا جو کچھ یوں تھا: "ہم نے خفیہ طور پر اس دنیا کا
معائنہ کیا ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ یہ دنیا ہم سے
کروڑوں سال پیچھے ہے ہم اس پر آرام سے قبضہ
کر سکتے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے اب
آپ ہمیں جو حکم دیں گے ہم وہی کریں گے۔"
ظاہر کے والد (عبدالمجید) نے ایک ٹھنڈی آہ بھری
پھر کہا۔ "اس کا مطلب ہے کسی دوسرے سیارے کی
مخلوق زمین پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ اس نے زمین
کے حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد اپنے سیارے
کو زمین پر قبضہ کرنے کی دعوت دی ہے۔
"اب کیا ہوگا ابو؟" ظاہر بھگوڑی نے پریشان
لہجے میں پوچھا۔
"قبضہ ہوگا..... اس زمین پر کسی اور کا
قبضہ ہوگا.....!!" ابو نے سر ہلاتے ہوئے جواب
دیا۔
"پوری دنیا پر اور..... اور "آریکا" پر بھی
جس نے ہمارے ملک پر قبضہ کر رکھا ہے۔"
"ہاں آریکا پر بھی..... آریکا کے سائنس دان
بھی اس سیارے کی مخلوق کے حملے سے نہیں بچ
سکیں گے۔"
پھر تو بہت اچھا ہوگا ابو..... مجھے آریکا سے
سخت نفرت ہے۔ اس نے ہمارے ملک کے لوگوں
کو آپس میں لڑوا دیا ہے اور اپنی فوجیں امن کے
بہانے اتار دی ہیں، ہمارے ملک کے فوجیوں اور
سیاستدانوں کو خرید رہا ہے اور اس نے ہمارے ملک
میں مہنگائی کتنی بڑھا دی ہے۔ دال، آٹے چاول،
مرچیں، گھی کھانے پینے کا سامان کتنا مہنگا ہو گیا
ہے۔" ظاہر بھگوڑی نے بڑے جوش سے کہا پھر
اس نے اپنے ابو سے پوچھا۔
"ابو کیا دوسرے سیارے کی مخلوق زمین پر قبضہ
کرنے کے بعد مہنگائی کا خاتمہ کر دے گی؟؟؟"
(جاری ہے)

تحائف

○ خانہ بدوش موسم کے حال کے بارے میں کبھی
اخبار نہیں پڑتا اور اپنے ہاتھ نکال کر جان لیتا ہے
کہ آج بارش اس کے خیمے پر برسے گی۔

○ بڑا بننے کے لئے چھوٹا ہونا پڑتا ہے۔

○ اگر کسی دن زندگی خوبصورت نہ لگے تو کسی
چھوٹے بچے کو آئس کریم کھاتے ہوئے دیکھ
لیں۔

مرسلہ: مولا بخش، کراچی

مچھر

محمد عظیم قریشی، اسلام آباد

مچھر ہے وہ مچھر ہے
جاتا سب کے گھر گھر ہے
رہیں رہیں کر کے آتا ہے
کان میں شور مچاتا ہے
ننھی سی ہے اس کی جان
کتنا دیتی ہے نقصان
کاٹتا ہے یہ ہولے سے
بن جاتے ہیں اولے سے
دشمن ہے یہ ننھا سا
ڈنک ہے جس کا زہریلا
ٹانگیں لمبی لمبی ہیں
کیسی ٹیڑھی میڑھی ہیں
مچھر ہے وہ مچھر ہے
جاتا سب کے گھر گھر ہے

مقابلہ کہانی نویسی

نئے لکھنے والوں کے لئے کہانی مقابلے کے ساتھ آنکھ مچولی حاضر ہے۔ اس مقابلہ کہانی نویسی کا عنوان ہے "مار گئی مہنگائی" اور "پاکستان خطرے میں ہے"۔ فل اسکیپ کے کم از کم دو صفحات پر ان موضوعات کو کہانی کی شکل دینی ہے۔

پانچ بہترین کہانیوں کو اشاعت کے لئے نہ صرف منتخب کیا جائے گا بلکہ انعام میں آنکھ مچولی کے خاص شمارے، رنگ برنگے اسٹیکرز کشمیری کہانیوں کا انتخاب اور معلوماتی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

آپ کی کہانیاں آسان زبان میں موجودہ مسائل اور ان کے حل کے حوالے سے ہونا ضروری ہیں..... تو پھر اٹھائیے کاغذ اور قلم اور لکھ ڈالیے لیکن ٹھہریئے..... کہانی لکھنے سے پہلے اس کی آخری تاریخ نوٹ کر لیجئے ــــ کہانی کی وصولی کی آخری تاریخ ہے ۱۵ جنوری ۱۹۹۵ء۔

ہمارا پتا ہے:

مقابلہ کہانی نویسی
قلم دوست۔ ماہنامہ آنکھ مچولی
۱۔ پی آئی پی کالونی، کراچی
پوسٹ کوڈ ۷۴۸۰۰

پھول اور کلیاں

سلمان خالق

تبسم عروج

فیضان خالق

انجم عروج

مُدے بھی پھُون تلنا آتا ہے !

میرا نام فیضان ہے

کون لڑے گا مجھ سے کشتی
نام ہے میرا "مسٹر کوی"

غنیا ظفر

آخری بات

محمد سلیم امام، متحدہ عرب امارات

زندگی سچائی کا دوسرا نام ہے۔ ہر فرد کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اسے سچ بول کر گزارے۔ سچائی کڑوی بھی ہوتی ہے جو لوگوں کو بعض اوقات بری بھی لگتی ہے لیکن یہ برا لگنا وقتی ہوتا ہے۔ جلد ہی انسان کو پتا چل جاتا ہے کہ وہ کڑوی بات سچی تھی، وہ اس کے فائدے کے لئے تھی کیونکہ ہر سچی بات انسان کے فائدے کے لئے ہی ہوتی ہے۔

کچھ لوگ جھوٹ بول کر زندگی گزارتے ہیں۔ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے وہ کئی جھوٹ بولتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر کوئی اعتماد نہیں کرتا۔ ان کا ذہن پریشانیوں اور وسوسوں میں گھرا رہتا ہے۔ وہ کبھی خوش نہیں رہتے جب کہ سچ بولنے والے ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں۔ انہیں کسی بات کا ڈر اور خوف نہیں ہوتا۔ وہ جھوٹے لوگوں کی طرح کسی طاقت سے نہیں ڈرتے کیونکہ انہیں اپنے سچ کی طاقت پر بھروسہ ہوتا ہے اور..... ایسے لوگوں کا ساتھی اللہ ہوتا ہے..... جھوٹ کو چھوڑ کر اور سچ کو اپنی زندگی میں شامل کر کے کیا آپ اللہ کو اپنا ساتھی بنانا پسند کریں گے.....!!!

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____

اب برش کرنا
کیا مزے کی بات!

فروٹی فلیور ٹوتھ پیسٹ
2 فلورائیڈ سسٹم کے ساتھ

مزیدار ذائقہ ۔ حفاظت بھی زیادہ

Crescent Communications International (Pvt) Ltd.

REGD. No. M-266 JANUARY 1995
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI